ماہنامہ

اشراق

لاہور

مئی ۲۰۲۵ء

1979 سے جاری شدہ
اشاعت کے 46 سال

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

"دین جس سب سے بڑی حقیقت کا علم بردار ہے، وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق ہی اس کا واحد مالک ہے اور وہی اس لائق ہے کہ اسے الٰہ مانا جائے۔ اس نے انسانوں کو ایک منصوبے کے تحت پیدا کیا ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے اور ایک دار الجزا ہے، جو اس دار الامتحان کے خاتمے کے بعد برپا ہو گا۔ دین داری یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ربانی بننے کی سعی و جہد کریں اور آخرت میں اس جنت کو حاصل کر لیں جو مالک ارض و سما کے مقبول بندوں کا مستقر ہے۔"

—— شذرات

- دین اللہ کے احکام کا مجموعہ ہے۔ جس میں اللہ نے کچھ کاموں کو کرنے سے روکا ہے اور کچھ کاموں کو انجام دینے کا حکم دیا ہے۔ جن کاموں کے کرنے سے منع کیا گیا ہے، ان کا مرتکب روز قیامت سزا پائے گا۔ جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کی تعمیل پر اللہ کی طرف سے وہاں اجر عطا ہو گا۔ (شذرات)
- ایک مومن کے لیے اِس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں کہ وہ صرف اللہ کا بندہ اور رسول کا امتی ہے، نہ کہ دوسرے کسی اور شخص یا فکر و نظریے کا اسیر۔ اِس کلمۂ اسلام کا یہ اولین تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ کو اپنا معبود بر حق و وحدہٗ لاشریک خدا تسلیم کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پورے دل و جان سے اپنا مطاع مطلق قرار دے۔ (اصلاح و دعوت)
- دین کا ماخذ صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ انھی سے قرآن ملا ہے اور انھی سے سنت۔ لیکن ہمارے ہاں المیہ یہ ہو گیا ہے کہ دین کا ماخذ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہو کر اماموں تک محدود ہوا، اور اب روبہ زوال ہوتے ہوتے حالت یہاں تک آگئی ہے کہ دین کا ماخذ ہر طالب علم کا اپنا مسلک، اپنا مدرسہ یا اپنا استاد رہ گیا ہے۔ (اصلاح و دعوت)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ وارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

جلد ۳۷ شمارہ ۵ مئی ۲۰۲۵ء ذوالقعدہ ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات

دین داری کا تصور — طالب محسن — ۴

قرآنیات

البیان: حٰم السجدہ ۴۱: ۳۷-۵۴ (۴) — جاوید احمد غامدی — ۷

معارف نبوی

اللہ نے اپنے رسول کو دشمنوں کے سب و شتم سے بچایا — جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز — ۱۹

سیر و سوانح

السابقون الاولون من الانصار (۵) — محمد وسیم اختر مفتی — ۲۵

نقطۂ نظر

تفسیر ’’مفتاح القرآن‘‘ کا ایک علمی مطالعہ (۲) — ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی — ۳۴

فقہی منہاج میں استدلال کے سقم اور اہل فلسطین کے لیے استطاعت کی شرط — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۴۲

اصلاح و دعوت

’کلمۂ اسلام‘ کی عظمت — محمد ذکوان ندوی — ۵۱

تعصب اور تنگ نظری — محمد صدیق بخاری — ۵۳

یسئلون

غیر مسلم: چند جدید تفہیمات (۲) — شاہد رضا — ۵۶

شخصیات

حیات امین احسن (۲۰) — محمد بلال — ۶۵

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد | محمد رفیع مفتی
طالب محسن | محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن | ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم | آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر | خورشید احمد ندیم
اظہار احمد | کوکب شہزاد
جنید حسن | مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

طالب محسن

دین داری کا تصور

دین داری ہمارے سماج میں اپنے مختلف تصورات اور رنگ رکھتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کون سا تصور اور رنگ درست ہے اور کون سا رنگ ناقص یا غلط ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں سریت کا غلبہ ہے۔ برصغیر کے کم و بیش تمام مذاہب میں اس کے لیے ریاضت کی ایک روایت قائم ہے۔ اگرچہ ریاضتوں کے اس نظام کی نظریاتی اور عملی تفصیلات باہم دگر کافی مختلف ہیں، لیکن ان کا مقصود کچھ باطنی اہداف کا حصول ہے۔ مسلمانوں کی ریاضتیں اپنی انفرادی ہیئت اور اسلامی تشخص رکھتی ہیں۔ مسلمان عوام کی نگاہ میں دین داری کا منتہا انھی ریاضتوں سے گزر کر عالم بالا سے ربط پیدا کر لینا ہے۔ برصغیر میں جن مسلمان بزرگوں کو عوام میں شہرت اور مقبولیت ملی، ان کے بارے میں بھی یہی تصور ہے کہ وہ مقبول بارگاہ ایزدی ہیں، مستجاب الدعوات ہیں اور امور غیب تک انھیں دسترس حاصل ہے اور وفات کے بعد بھی ان کے مقابر فیوض و برکات کا مرکز ہیں اور اپنے زائرین کی مدد و استعانت کرتے ہیں۔ اس تصور کے تحت دین دو درجوں میں منقسم ہے: ایک درجہ دین کے اوامر و نواہی کا ہے، جس کے مخاطب عام و خواص تمام مسلمان ہیں۔ اس کے لیے 'شریعت' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ایک درجہ ایمان و عمل کے اس نظام کا ہے جس کا تعلق صرف خواص کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے 'طریقت' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس تصور کے تحت شریعت معمول کی دین داری ہے۔ طریقت اعلیٰ درجے کی دین داری ہے۔ اس کے تحت عوام میں بھی دین داری کا ایک تصور پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل اور لائق تو نہیں سمجھتے کہ وہ طریقت کی ریاضتوں سے گزر کر اعلیٰ مناصب و مراتب پا سکیں، لیکن وہ یہ ضرور طے کر لیتے ہیں کہ

اس راہ پر چلنے والوں کی دریافتوں اور حاصلات سے مستفید ہوں۔ ان کے ہاں جس طرح کی دین داری اور جس طرح کے دینی اعمال پائے جاتے ہیں، اس میں بزرگوں کے حضور اور مزارات پر حاضری، کچھ آیات یا کلمات کا ورد، ثواب کے حصول کے لیے قرآن کی ناظرہ تلاوت، دم درود اور تعویذوں سے اشتغال وغیرہ۔ شریعت کی پابندی بالعموم رسمی ہوتی ہے۔ معیشت اور معاشرت سے متعلق دین کے احکام کم ہی اہمیت حاصل کر پاتے ہیں۔ ان کے ہاں تصور زندگی یہ بنتا ہے کہ تدبیر سے زیادہ تاثیرات موثر ہیں اور آخرت کی نجات کا انحصار شفاعت پر ہے۔

مسلمان معاشرے میں دین داری کی مذکورہ صورت سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگ دین کے احکام کی پابندی کو اپنا معمول بناتے ہیں۔ ان کے ہاں اس تصور کا غلبہ ہوتا ہے کہ دین اللہ کے احکام کا مجموعہ ہے۔ جس میں اللہ نے کچھ کاموں کو کرنے سے روکا ہے اور کچھ کاموں کو انجام دینے کا حکم دیا ہے۔ جن کاموں کے کرنے سے منع کیا گیا ہے، ان کا مرتکب روز قیامت سزا پائے گا۔ جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کی تعمیل پر اللہ کی طرف سے وہاں اجر عطا ہو گا۔ خدا سے ان کے تعلق کی نوعیت آقا اور غلام کے تعلق کی ہے۔ اس تصور کے تحت جو دین داری وجود میں آتی ہے، وہ پابندیِ احکام کی دین داری ہے۔ اس تصور کے تحت جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں زیادہ زور صحت ایمان اور صحت عمل پر ہوتا ہے۔ اور یہ جذبہ اکثر دین میں سختی کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ احکام کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی طے کر دی جاتی ہیں اور ان فقہی موشگافیوں کو شریعت کے ہم پلہ بنا دیا جاتا ہے۔ اس رنگ میں ایک اور رنگ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ عقائد کی صحت کے باب میں بھی ایسے نکات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ ذرا سا انحراف بھی شرک قرار دے دیا جائے۔ اعمال میں بھی بہت سے عمل بدعت ٹھیرا دیے جاتے ہیں۔

بعض تحریکوں نے دین داری کی ایک اور صورت متعارف کرائی ہے۔ غلبۂ دین کی جد وجہد کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اسے زندگی اور دین کے مقصد کے طور پر شعور کا حصہ بنایا گیا، جس کے تحت نماز روزے سے زیادہ دینی وقعت رکھنے والا کام اعلاے کلمۃ اللہ کی جد وجہد ہے۔ اس کے لیے جلسے، جلوس، میٹنگز اور ملاقاتیں سب سے بڑا دینی عمل بن جاتا ہے۔ اس کے رد عمل میں انقلاب کے بجاے دعوت کا نعرہ بھی بلند ہوا۔ اس نعرے کے متاثرین کے ہاں بھی دعوتی سرگرمیوں کو وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو انقلابیوں کے ہاں انقلابی سرگرمیوں کو حاصل تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ دین جس سب سے بڑی حقیقت کا علم بردار ہے، وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق ہی اس کا

واحد مالک ہے اور وہی اس لائق ہے کہ اسے اللہ مانا جائے۔ اس نے انسانوں کو ایک منصوبے کے تحت پیدا کیا ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے اور ایک دار الجزا ہے، جو اس دار الامتحان کے خاتمے کے بعد برپا ہو گا۔ دین داری یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ربانی بننے کی سعی وجہد کریں اور آخرت میں اس جنت کو حاصل کر لیں جو مالک ارض و سما کے مقبول بندوں کا مستقر ہے۔

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ حٰم السجدۃ

(۴)

وَمِنۡ اٰیٰتِہِ الَّیۡلُ وَالنَّھَارُ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ ؕ لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَھُنَّ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۳۷﴾

(لوگو، جو زمین و آسمان کا خالق ہے)، یہ رات اور دن اور سورج اور چاند بھی اُسی کی نشانیوں میں سے ہیں۔[۴۴] تم نہ سورج کو سجدہ کرو[۴۵] اور نہ چاند کو، بلکہ اُس اللہ کو سجدہ کرو جس نے اِنھیں بنایا ہے،[۴۶] اگر تم اُسی کی بندگی کرنے والے ہو۔[۴۷] ۳۷

۴۴۔ یعنی نہ خدا ہیں، نہ کسی پہلو سے خدائی میں شریک ہیں، بلکہ خدا کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی نشانیوں میں سے ہیں —— یہ اب اُسی مضمون کو دوبارہ لیا ہے جو آیات ۹-۱۲ میں بیان ہوا ہے۔ بیچ میں جو مطالب آئے ہیں، وہ تنبیہ و تذکیر یا تسکین و تسلی کی نوعیت کے تھے، اِس وجہ سے کوئی بعد پیدا نہیں ہوا۔

۴۵۔ یہ عبادت کی تعبیر ہے، اِس لیے کہ یہ اُس کے سب سے زیادہ نمایاں مظاہر میں سے ہے۔

۴۶۔ اصل میں 'خَلَقَھُنَّ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس میں ضمیر جمع اُن سب چیزوں کی طرف لوٹتی ہے جو پیچھے مذکور ہیں۔

فَاِنِ اسۡتَكۡبَرُوۡا فَالَّذِيۡنَ عِنۡدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوۡنَ لَهٗ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَهُمۡ لَا يَسۡـَٔمُوۡنَ ﴿۳۸﴾ السجدة

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الۡاَرۡضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ ؕ اِنَّ الَّذِىۡۤ اَحۡيَاهَا لَمُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۳۹﴾

پھر اگر یہ تکبر کریں تو پروا نہیں، جو فرشتے تیرے پروردگار کی بارگاہ میں ہیں، وہ شب و روز اُسی کی تسبیح کر رہے ہیں اور (اُن کے ذوق و شوق کا یہ حال ہے کہ) کبھی اکتاتے نہیں ہیں۔[۴۸] ۳۸

اور اُسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل بے جان پڑی ہے۔ پھر جب ہم (اپنی عنایت سے) اُس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ (زندہ ہو کر) لہلہاتی اور ابھرتی ہے۔[۴۹] جس نے اُس کو زندہ کیا، یقیناً وہی مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۳۹

۴۷۔ یعنی خدا کی بندگی کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ بندگی اِس طرح ہونی چاہیے کہ جو علامات اُس کی بندگی کے لیے خاص ہیں، اُن میں بھی کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں کی جو بندگی کرتے تھے تو اُس کے متعلق اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ صرف اِس لیے وہ کرتے ہیں کہ یہ چیزیں خدا کی قربت کا ذریعہ ہیں۔ گویا اُن کی بندگی، اُن کے زعم میں، خدا ہی کی بندگی تھی۔ اِس ٹکڑے میں اُن کے اِسی زعم کی تردید ہے۔“

(تدبر قرآن ۷/۱۰۸)

۴۸۔ مطلب یہ ہے کہ اِن سے کہیں اعلیٰ و اشرف مخلوقات خدا کی بندگی کے لیے موجود ہیں، یہاں تک کہ وہ فرشتے بھی جنھیں یہ معبود بنائے بیٹھے ہیں تو خدا کو اِن کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ اِس لیے اِن کو اِن کے حال پر چھوڑو اور تم بھی اِن کی کوئی پروا نہ کرو۔

۴۹۔ یعنی سبزے اور نباتات سے ابھرتی، اپچتی اور بالکل تر و تازہ ہو کر لہلہانے لگتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخۡفَوۡنَ عَلَیۡنَا ؕ اَفَمَنۡ یُّلۡقٰی فِی النَّارِ
خَیۡرٌ اَمۡ مَّنۡ یَّاۡتِیۡۤ اٰمِنًا یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ اِنَّہٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ
بَصِیۡرٌ ﴿۴۰﴾
اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالذِّکۡرِ لَمَّا جَآءَہُمۡ ۚ وَ اِنَّہٗ لَکِتٰبٌ عَزِیۡزٌ ﴿۴۱﴾ ۙ لَّا یَاۡتِیۡہِ الۡبَاطِلُ

ہماری اِن نشانیوں کے بارے میں جو لوگ کج روی اختیار کر رہے ہیں،[۵۰] وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔[۵۱] سو (فیصلہ کر لیں کہ) آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جائے گا یا وہ جو قیامت کے دن آئے گا اور اُسے کسی بات کا کھٹکا نہ ہو گا۔ (لوگو)، تم جو چاہو، سو کرو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ جو تم کر رہے ہو، خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔[۵۲] ۴۰

جن لوگوں نے خدا کی اِس یاد دہانی کا انکار کر دیا ہے، جب کہ وہ اُن کے پاس آ گئی ہے،[۵۳] اُنھوں نے اپنی شامت بلا لی ہے۔[۵۴] حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اِس میں نہ باطل اِس

۵۰۔ یعنی یہ نشانیاں تو کسی اور طرف رہنمائی کر رہی ہیں اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث وہ کوئی اور راہ اختیار کر رہے اور لوگوں کو بھی اُسی کی طرف موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۵۱۔ اِس ابہام میں جو غضب ناکی مضمر ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چھپے ہوئے نہیں ہیں تو لازماً گرفت میں آئیں گے اور ایک دن اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھیں گے۔

۵۲۔ یہاں بھی وہی اسلوب ہے جو اوپر اختیار فرمایا ہے۔

۵۳۔ یعنی جب کہ اُس کے مضامین، اُس کی معجز بیانی اور اُس کے دلائل کی قوت، ہر چیز اُن کے سامنے آ چکی ہے۔

۵۴۔ یہ خبر ہے جو اصل میں حذف کر دی ہے اور اِس حذف میں بڑی بلاغت ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ اِن کی بدانجامی کو ظاہر کرنے کے لیے اِن کے جرم کی سنگینی ہی کافی ہے، اُسے الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ﴿۴۲﴾

کے آگے سے داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔[55] یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اُس ہستی کی

۵۵۔ قرآن کے بارے میں جو دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے، یہ اُس کی دلیل بیان کی ہے کہ یہ لفظ اور معنی، دونوں کے اعتبار سے بالکل محفوظ اور اپنی دلالت میں بالکل قطعی ہے، اِس میں جن وانس کے کسی شیطان کی دراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے بعض پہلوؤں کی مزید وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”ایک یہ کہ قرآن اپنے آگے اور پیچھے، دونوں طرف سے بالکل محفوظ ہے۔ اِس کو اتارنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اِس کو لانے والے جبریل امین ہیں، اِس کے حامل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اِس کو نقل و قبول کرنے والے اِس خلق کے پاکیزہ ترین اخیار و صالحین ہیں۔ گویا ابتدا سے لے کر انتہا تک 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است'۔ اِس میں کہیں بھی شیطان کی دراندازی کے لیے کوئی روزن نہیں ہے، نہ اِس کے آغاز کی طرف سے، نہ اس کی انتہا کی طرف سے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا، جیسا کہ 'وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ' کے الفاظ سے واضح ہے، خود اہتمام فرمایا اور یہ قرآن مجید کا وہ امتیاز ہے جو اِس سے پہلے نازل ہونے والے صحیفوں کو حاصل نہیں ہوا۔ تورات وانجیل وغیرہ کی حفاظت کی ذمہ داری اُن کے حاملین پر ڈالی گئی تھی جو اُس کا حق ادا نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صحیفے بالکل محرف ہو کے رہ گئے اور اِن کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا، لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا اور اُس کو قیامت تک کے لیے ہر قسم کی آمیزش سے بالکل محفوظ کر دیا۔

اِس حفاظت کے کئی پہلو ہیں:

ایک یہ کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں اللہ تعالیٰ نے اِس امر کا خاص اہتمام فرمایا کہ قرآن کی وحی میں شیاطین کوئی مداخلت نہ کر سکیں۔ یوں تو اِس نظام کائنات میں یہ مستقل اہتمام ہے کہ شیاطین ملاءِ اعلیٰ کی باتیں نہ سن سکیں، لیکن سورۂ جن کی تفسیر میں ہم واضح کریں گے کہ نزول قرآن کے زمانے میں یہ اہتمام خاص طور پر تھا کہ شیاطین وحی الٰہی میں کوئی مداخلت نہ کر پائیں تاکہ اُن کو قرآن میں اُس کے آگے سے (مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ) کچھ گھسانے کا موقع نہ مل سکے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کام کے لیے اپنے جس فرشتہ کو منتخب کیا، اُس کی صفت قرآن میں 'ذِيْ قُوَّةٍ'

مطاع، قوی، امین اور 'عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ' وارد ہوئی ہے، یعنی وہ فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ ارواح خبیثہ اُس کو مغلوب نہیں کر سکتیں؛ وہ تمام فرشتوں کا سردار ہے؛ وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتا؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امانت اُس کے حوالے کی جاتی ہے، وہ اُس کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے، مجال نہیں ہے کہ اُس میں زیر زبر کا بھی فرق واقع ہو سکے؛ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقرب ہے جو اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے برتر ہے —— ظاہر ہے کہ یہ اہتمام بھی اِسی لیے فرمایا گیا کہ قرآن میں اُس کے منبع کی طرف سے کسی باطل کے گھسنے کا امکان باقی نہ رہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِس امانت کو اٹھانے کے لیے جس بشر کو منتخب فرمایا، اول تو وہ ہر پہلو سے خود خیر الخلائق تھا، ثانیاً قرآن کو یاد رکھنے اور اُس کی حفاظت و ترتیب کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تنہا اُس کے اوپر نہیں ڈالی، بلکہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ'* (اور تم اِس قرآن کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیز نہ چلاؤ، ہمارے اوپر ہے اِس کے جمع کرنے اور اِس کے سنانے کی ذمہ داری تو جب ہم اِس کو سنا چکیں تو اُس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ذمے ہے اِس کی وضاحت)۔ روایات سے ثابت ہے کہ جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا، اُس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقرب صحابہ یاد بھی رکھتے اور ہر رمضان میں حضرت جبریل کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس کا مذاکرہ بھی فرماتے رہتے تاکہ کسی سہو و نسیان کا اندیشہ نہ رہے اور یہ مذاکرہ اُس ترتیب کے مطابق ہوتا جس ترتیب پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مرتب کرنا پسند فرمایا۔ یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارک کے آخری رمضان میں یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔ پھر اِسی ترتیب اور اِسی قراءت کے مطابق پورا قرآن ضبط تحریر میں لایا گیا اور بعد میں خلفاے راشدین نے اِسی کی نقلیں مملکت کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں۔** یہ اہتمام پچھلے

* ۷۵: ۱۶-۱۹۔

** یہ اگر کیا گیا تو محض اہتمام اشاعت کے لیے کیا گیا، جس طرح کہ مسلمانوں کی حکومتیں اب بھی کرتی رہتی ہیں۔ اِس سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ اِس طرح قرآن کا کوئی سرکاری نسخہ مرتب کرایا گیا تھا۔ قرآن جس طرح اب منتقل کیا جاتا ہے، اُسے ابتدا ہی سے لکھنے والے اِسی طرح لکھ کر اور یاد کرنے والے اِسی طرح یاد کر کے اگلی نسلوں کو منتقل کرتے رہے ہیں۔ وہ کبھی کسی سرکاری نسخے کا محتاج نہیں ہوا۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۴۳﴾

طرف سے اتاری گئی ہے جو سراسر حکمت ہے، ستودہ صفات ہے۔[56] ۴۱-۴۲

(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)، تمھیں (ان لوگوں کی طرف سے) وہی باتیں کہی جا رہی ہیں جو تم سے پہلے رسولوں کو کہی جا چکی ہیں۔ (اس وقت اِنھیں ڈھیل دی گئی ہے، لیکن یہ بے خوف نہ ہوں)۔ واقعہ یہ ہے کہ تیرا پروردگار مغفرت والا اور اِس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔ ۴۳

صحیفوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ تورات کے متعلق تو یہ علم بھی کسی کو نہیں ہے کہ اُس کے مختلف صحیفے کس زمانے میں اور کن لوگوں کے ہاتھوں مرتب ہوئے۔

چوتھا یہ کہ قرآن اپنی فصاحت الفاظ اور بلاغت معنی کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ جس کے سبب سے کسی غیر کا کلام اُس کے ساتھ پیوند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام بھی، باوجودیکہ آپ اِس قرآن کے لانے والے اور افصح العرب والعجم ہیں، اِس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اِس وجہ سے اِس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی غیر کا کلام اِس کے ساتھ مخلوط ہو سکے۔ چنانچہ جن مدعیوں نے قرآن کا جواب پیش کرنے کی جسارت کی، اُن کی مزخرفات کے نمونے ادب اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ اُن کو قرآن کے مقابل میں رکھ کر موازنہ کر لیجیے، دونوں میں گہر اور پشیز کا فرق نظر آئے گا —— اِس طرح گویا پیچھے سے بھی (وَمِنْ خَلْفِهٖ) قرآن میں دراندازی کی راہ مسدود کر دی گئی۔

پانچواں یہ کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی زبان کی حفاظت کا بھی قیامت تک کے لیے وعدہ فرمالیا۔ دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو اُن کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے، بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہو گئیں جن کا سراغ اب ناممکن ہے، لیکن قرآن کی اصل زبان محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ اِس وجہ سے ترجموں اور تفسیروں کی راہ سے اِس میں کسی باطل کے گھسنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر اِس میں کسی باطل کو گھسانے کی کوشش کی جائے گی تو اہل علم اصل پر پرکھ کر اُس کو چھانٹ کر الگ کر سکتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۱۱)

۵۶۔ چنانچہ یہ محض اُس کا جود و کرم ہے کہ اُس نے یہ حکیمانہ کلام اتارا اور اپنی خلق کو اِس عظیم نعمت سے نوازا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ
قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ
وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ

(کہتے ہیں کہ یہ یاددہانی پہلی کتابوں کی زبان میں کیوں نہیں اتاری گئی)؟[۵۷] ہم اگر اِس قرآن کو عجمی قرآن بنا کر اتارتے تو اُس وقت یہ اعتراض اٹھاتے کہ اِس کی آیتیں (خود ہماری زبان میں) کھول کر بیان کیوں نہیں کی گئیں؟ کیا تعجب کی بات ہے کہ کلام عجمی اور مخاطب عربی! اِن سے کہو، ایمان والوں کے لیے تو یہ ہدایت ہے اور (دل کی بیماریوں کی) شفا ہے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے تو اُن کے کانوں میں، البتہ یہ گرانی ہے اور اُن کے اوپر یہ ایک حجاب بن گیا ہے۔[۵۸] یہی ہیں جو (قیامت کے دن) اب کسی دور کی جگہ سے پکارے جائیں گے۔[۵۹] ۴۴

اور (کہتے ہیں کہ موسیٰ کی کتاب کے بعد اِس نئی کتاب کی ضرورت کیوں پیش آئی)؟ یقیناً ہم نے

۵۷۔ یہ اعتراض غالباً یہود کا القا کیا ہوا ہے کہ اِس سے پہلے اگر تمام الہامی کتابیں ہماری زبان میں اتری ہیں تو یہ نئی کتاب عربی زبان میں کیوں نازل کی گئی ہے؟ اِس طرح کے اعتراضات، ظاہر ہے کہ وہ بنی اسمٰعیل کو قرآن جیسی نعمت سے محروم کرنے کے لیے ایجاد کرتے تھے، لیکن قریش کے نادان لیڈر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جوش میں اِنھی کو آگے نقل کرنا شروع کر دیتے تھے۔

۵۸۔ یعنی چونکہ تاریکی کے خوگر ہیں، اِس لیے یہ آسمانی روشنی نمودار ہوئی ہے تو اِن کی آنکھیں ایسی خیرہ ہو گئی ہیں کہ اِن کی رہنمائی کے بجاے یہ اِن کے لیے اندھے پن کا ذریعہ بن گئی ہے۔

۵۹۔ یہ وہی پکار ہے جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۱۰۸ میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت تو خدا کا پیغمبر اِن کے درمیان کھڑے ہو کر اِن کو بہت قریب سے پکار رہا ہے اور یہ سن کر نہیں دے رہے، مگر وہ دن بھی قریب آنے والا ہے، جب قیامت کا داعی بہت دور سے پکارے گا اور یہ اُس کے پیچھے بھاگ رہے ہوں گے۔

رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾
اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ

موسیٰ کو بھی کتاب عطا فرمائی تھی، مگر اُس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا[۶۰] اور تیرے پروردگار کی طرف سے اگر ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی[۶۱] تو (خدا کی کتاب کے ساتھ اِس ظلم کی پاداش میں) اِن حاملین کتاب کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تو اب اُس کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جو الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔ (اِس سے نجات کے لیے یہ خدا کی اِس یاددہانی سے فائدہ اٹھائیں تو اِنھی کا بھلا ہے، اِس لیے یاد رکھیں کہ) جو نیک عمل کرے گا تو اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا تو اُس کا وبال اُسی پر ہوگا اور تیرا پروردگار اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔[۶۲] ۴۵-۴۶

اور (کہتے ہیں کہ یہ جس قیامت سے ڈرا رہے ہو، یہ کب نمودار ہو گی؟ اِن سے کہو)، قیامت کا علم تو اللہ ہی سے متعلق ہے۔ اور (صرف قیامت ہی نہیں)، یہ اُسی کا علم ہے کہ جس کے بغیر نہ

۶۰۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے نزول کا مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وہ دین و شریعت سے متعلق لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کر دیں۔ چنانچہ مدعا یہ ہے کہ جب تورات میں اُس کے حاملین کی اُس کی حفاظت سے بے پروائی اور اُس کے کچھ حصے چھپانے اور کچھ ظاہر کرنے کے نتیجے میں ایسے اختلافات پیدا ہو گئے کہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے بجائے وہ خود اختلافات کا ذریعہ بن گئی تو ضروری تھا کہ حق و باطل میں امتیاز اور لوگوں پر اتمام حجت کے لیے ایک نئی کتاب نازل کی جائے۔

۶۱۔ یعنی یہ بات کہ اِنھیں ابھی مہلت دینی ہے۔

۶۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ'۔ اِن میں مبالغہ پر جو نفی آئی ہے، وہ مبالغہ فی النفی کے لیے ہے۔ یہ عربی زبان کا معروف اسلوب ہے اور ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

مِنۡ اُنۡثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِهٖ ؕ وَیَوۡمَ یُنَادِیۡهِمۡ اَیۡنَ شُرَکَآءِیۡ ۙ قَالُوۡۤا اٰذَنّٰکَ ۙ
مَامِنَّا مِنۡ شَهِیۡدٍ ﴿۴۷﴾ ۚ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا کَانُوۡا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَظَنُّوۡا مَا
لَهُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿۴۸﴾
لَا یَسۡـَٔمُ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ دُعَآءِ الۡخَیۡرِ ۫ وَاِنۡ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَیَـُٔوۡسٌ قَنُوۡطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنۡ
اَذَقۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنَّا مِنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَیَقُوۡلَنَّ هٰذَا لِیۡ ۙ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ

میوے اپنے غلاف سے باہر نکلتے ہیں اور نہ کوئی عورت حاملہ ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے۔ (یہ اپنے شریکوں کے بل پر اُس سے بے پروا ہو رہے ہیں تو) یاد رکھیں، جس دن وہ اِن کو پکارے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں، (اُنھیں بلاؤ کہ تمھیں چھڑا لیں) تو کہیں گے کہ ہم نے تجھ سے عرض کر دیا کہ آج ہم میں سے کوئی بھی اُن کی گواہی دینے والا نہیں ہے۔[۶۳] اُس وقت وہ سب اِن سے ہوا ہو جائیں گے جنھیں یہ اِس سے پہلے پکارتے رہے اور یہ سمجھ لیں گے[۶۴] کہ اب اِن کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔ ۴۷-۴۸

انسان (کا معاملہ بھی عجیب ہے، وہ مصیبتوں کو آتے دیکھ کر) بھلائی کی دعا سے نہیں تھکتا، لیکن اگر اُس پر مصیبت آ جائے (اور وہ دیکھے کہ دعائیں نتیجہ خیز نہیں ہو رہی ہیں) تو مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اُس مصیبت کے بعد جو اُس کو پہنچی تھی، ہم اُس کو اپنی رحمت کی لذت چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرا حق ہی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت برپا ہو گی، لیکن (بالفرض ہوئی اور)

۶۳۔ یعنی اپنے جن معبودوں پر ہم کو ناز تھا، اُن کی حقیقت واضح ہو گئی۔ اب کوئی بھی اِس اعتراف کے لیے تیار نہیں ہے کہ تیرے ساتھ کسی شرک کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

۶۴۔ اصل میں لفظ ’ظَنّ‘ استعمال ہوا ہے، لیکن یہ یہاں یقین کے معنی میں ہے اور اِس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ نادیدہ حقیقتوں کے بارے میں جو یقین انسان کو حاصل ہوتا ہے، اُس کے لیے یہی لفظ موزوں ہے۔

وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا
عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۰﴾
وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ
دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾

میں اپنے رب کی طرف لوٹا دیا گیا تو کچھ شک نہیں کہ میرے لیے اُس کے ہاں بھی اچھا ہی ہے۔ (یہ اِن کے خواب ہیں جن کے بل پر یہ پیغمبر کا مذاق اڑا رہے ہیں)۔ سو اِن منکروں کو ہم ضرور اِن کے اعمال سے آگاہ کریں گے اور اِن کو لازماً ایک سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔[65] ۴۹-۵۰

انسان (کا معاملہ یہی ہے کہ اُس) پر جب ہم عنایت فرماتے ہیں تو وہ (غرور و استکبار سے) منہ موڑتا اور پہلو بدل لیتا ہے[66] اور جب اُس کو تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی لمبی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے۔[67] ۵۱

۶۵۔ اِس سے پہلے جو بات نقل ہوئی ہے، وہ ایسی احمقانہ تھی کہ بات کو روک کر اُس پر یہ نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے۔ نیز اوپر سے بات لفظ 'اِنْسَان' کے ساتھ کی جا رہی تھی، لیکن اِس سے مراد چونکہ وہی منکرین ہیں جن کا ذکر پیچھے سے چلا آ رہا ہے، اِس لیے یہاں اُسے کھول دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس پست ہمتی اور ناشکرے پن اور اِس کے ساتھ انسان کے جس طنطنے کا ذکر ہوا ہے، وہ اِنھی منکرین کے باطن کی تصویر ہے جو پیغمبر کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

۶۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ'۔ اِن سے وہی مضمون ادا کیا گیا ہے جو قرآن نے دوسرے مقامات میں 'تَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ' یا 'ثَانِيَ عِطْفِهٖ' وغیرہ محاورات سے ادا کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ غرور و استکبار سے اعراض کرنے اور منہ پھیرنے کی تعبیر ہے۔ 'جانب' کے معنی پہلو کے ہیں۔ آدمی جب کسی سے غرور کے ساتھ منہ موڑتا ہے تو مونڈھے جھٹک کر اپنا پہلو بدلتا اور وہاں سے چل دیتا ہے۔ اِسی حالت کو یہاں 'نَاٰ بِجَانِبِهٖ' سے تعبیر فرمایا ہے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۱۲۷)

۶۷۔ اوپر جس کردار کی تفصیل فرمائی ہے، یہ مخاطبین کو تنبیہ و تہدید کے بعد آخر میں اُس کا خلاصہ کر دیا ہے۔

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرۡتُمۡ بِهٖ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ هُوَ فِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِيۡدٍ ﴿۵۲﴾

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ

اِن سے کہو، ذرا غور تو کرو کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا کی طرف سے ہوا اور اِس پر بھی تم اِس کا انکار کرتے رہے تو اُس سے زیادہ گم راہ کون ہو گا جو بہت دور کی مخالفت میں جا پڑا؟[۶۸] ۵۲

(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر، اور یہ بھی متنبہ ہو جائیں)، اِنھیں ہم عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اِن کے اندر بھی،[۶۹] یہاں تک کہ اِن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن

۶۸۔ یہ قرآن پر پوری سنجید گی اور اہمیت کے ساتھ غور کرنے اور اُس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی دعوت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس دعوت کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن اپنی تکذیب کرنے والوں کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے اور جن دلائل کے ساتھ آگاہ کر رہا ہے، وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ سہل انگاری سے نظر انداز کر دی جائے یا ہنسی مسخری میں اڑا دی جائے، بلکہ بڑے ہی قوی دلائل کی شہادت کے ساتھ یہ بڑے ہی ہول ناک انجام کی خبر ہے۔ اِس وجہ سے جو لوگ ڈھٹائی سے اِس کو جھٹلا رہے ہیں، وہ کم از کم اِس کے دعوے کی صحت کے امکان کے پہلو کو نظر انداز نہ کریں۔ اگر وہ اس کی صحت کا امکان محسوس کرتے ہیں (اور کوئی ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم بھی اس کے امکان سے انکار نہیں کر سکتا) تو دانش مندی کا تقاضا اور عاقبت بینی کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اِس قرآن پر سو بار غور کریں اور جو فیصلہ بھی کریں، اُس کے نتائج پر دور تک سوچ کر کریں۔ اگر وہ اس کو اختیار کریں گے تو کوئی چیز کھوئیں گے نہیں، بلکہ پائیں گے اور سب کچھ پائیں گے اور اگر محض ضد اور مخاصمت کے جنون میں مبتلا ہو کر اس کا انکار کر دیں گے تو یہ مخاصمت اُن کو اتنی دور لے جا کر پھینکے گی، جہاں سے پھر لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا ـــــ مطلب یہ ہے کہ اِس معاملے پر اس کی حقیقی اہمیت سامنے رکھ کے غور کرو۔ اگر ضد، انانیت، حسد اور مخاصمت کو اس میں دخیل ہونے دیا گیا تو یہ کشمکش نہایت تباہ کن انجام پر منتہی ہو گی۔" (تدبر قرآن ۷/ ۱۲۸)

۶۹۔ یعنی مکہ کے اطراف میں بھی اور خود مکہ میں، قریش کے اندر بھی، جہاں سے اچھے لوگ نکل کر پیغمبر کے ساتھی بن جائیں گے اور غلبۂ حق اور ہزیمت باطل کے ایسے شواہد سامنے آئیں گے کہ قرآن کی حقانیت اِن

اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ ؕ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍ مُّحِيۡطٌ ﴿۵۴﴾

بالکل حق ہے۔ اور (تمھاری تسلی کے لیے) کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تمھارا پروردگار ہر چیز کا گواہ ہے؟[۷۰] سنو، یہ لوگ اپنے رب کے حضور پیشی کی طرف ہی سے شک میں ہیں۔[۷۱] سنو، وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔[۷۲] ۵۳-۵۴

میں سے ہر شخص پر واضح ہو جائے گی۔

۷۰۔ یعنی غلبۂ حق کی جو بشارت تمھیں دی جا رہی ہے، اُس کے ظہور کے ایک ایک مرحلے سے واقف ہے۔ اِس وجہ سے مطمئن رہو، اُس کی ہر بات پوری ہو کے رہے گی۔

۷۱۔ یہ اُن کی اصل علت فساد سے پردہ اٹھایا ہے کہ اِنھیں آخرت کا یقین نہیں ہے، لہٰذا اِسی چیز نے اِن کے اندر وہ عاقبت نااندیشی اور ہٹ دھرمی پیدا کر دی ہے جس کا مشاہدہ کر رہے ہو۔

۷۲۔ چنانچہ نہ کوئی چیز اُس کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے اور نہ کوئی اُس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکتا اور اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر نکل سکتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہے گا اور جب چاہے گا، کر ڈالے گا۔

سیرۃ النبی

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز

اللہ نے اپنے رسول کو دشمنوں کے سب و شتم سے بچایا

—— ۱ ——

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ:[۱] قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَلَا تَعْجَبُونَ كَيْفَ يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّي شَتْمَ قُرَيْشٍ وَلَعْنَهُمْ، يَشْتِمُونَ مُذَمَّمًا، وَيَلْعَنُونَ مُذَمَّمًا وَأَنَا مُحَمَّدٌ».

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے صحابہ سے) فرمایا: کیا تمھیں اِس بات پر حیرانی نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کس طرح قریش کی گالیوں اور لعنتوں کو مجھ سے ہٹا دیتا ہے؟ وہ (کسی) 'مذمم' کو گالیاں دیتے اور اُس پر لعنت کرتے ہیں، جب کہ میں 'محمد' ہوں۔[۲]

لے اپنے ساتھ آخری درجے کی زیادتی پر کسی رد عمل کے بجاے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جس زاویے سے چیزوں کو دیکھنے کی طرف توجہ دلائی ہے، یہی پیغمبرانہ اخلاق ہے۔ آپ نے اِسی بنا پر فرمایا تھا کہ میں اخلاق عالیہ کو اُن کے اتمام تک پہنچانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۳۵۳۳ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے تنہا راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

اِس کے متابعات اِن مصادر میں دیکھے جا سکتے ہیں:

مسند حمیدی، رقم ۱۱۷۰۔ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۱/ ۱۰۵۔ مسند احمد، رقم ۷۳۳۱، ۸۴۷۸، ۸۸۲۵۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۵۶۰۲۔ السنن الصغریٰ، نسائی، رقم ۳۴۳۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۵۰۳۔ دلائل النبوۃ، ابونعیم، رقم ۱۴۲۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۱۴۳۔ شعب الایمان، بیہقی، رقم ۱۳۳۷۔ دلائل النبوۃ، بیہقی، رقم ۱/ ۱۵۲۔

اِس روایت کا کوئی شاہد موجود نہیں ہے۔

المصادر والمراجع

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (١٤٢٧هـ/٢٠٠٦م). **العلل**. ط ١. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (١٢٧١هـ/١٩٥٢م). **الجرح والتعديل**. ط ١. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن الأعرابي أحمد بن محمد. (١٤١٨هـ/١٩٩٧م). **معجم ابن الأعرابي**. ط١. تحقيق وتخريج: عبد المحسن بن إبراهيم. السعودية: دار ابن الجوزي.

ابن حبان، محمد بن حبان البُستي. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حبان محمد بن حبان. (١٤٢٠ھ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦ھ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط ٣. تحقيق: دائرة المعرف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧ھ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط ١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: لبنان. مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣ھ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط ١. تحقيق: د. عاصم بن عبدالله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤ھ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط ١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧ھ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن سعد محمد بن سعد. (١٤٠٨ھ). **الطبقات الكبرى**. ط٢. تحقيق: زياد محمد منصور. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

ابن عدي عبد الله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨ھ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط ١. تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال أبو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠ھ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط ٢. تحقيق: عبدالقيوم عبد رب النبي. مكة مكرمة: المكتبة الامدادية.

ابن المِبرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣ھ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط ١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. لبنان، بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل**. ط ٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي.

بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩هـ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط ١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

أبو إسحاق الحويني. (١٤٣٣هـ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط ١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط ١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **دلائل النبوة**. ط٢. تحقيق: الدكتور محمد رواس قلعه جي، وعبد البر عباس. بيروت: دار النفائس.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ٢. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ١. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (د.ت). **مسند أحمد**. ط١. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت. دار الفكر.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (١٣٩٧هـ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط ١. حلب. القاهرة. دار الوعي مكتبة دار التراث.

البخاري محمد بن إسمٰعيل. (١٤٢٢هـ). **الجامع الصحيح**. ط١. تحقيق: زهير الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤٠٥هـ). **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط١. بيروت: دار الكتب العلمية.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبري**. ط١. تحقيق: محمد عبد القادر عطاء.

مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

البيهقي أبو بكر أحمد بن الحسين الخراساني. (١٤٢٣هـ/٢٠٠٣م). **شعب الإيمان**. ط١. تحقيق: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد. الرياض: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع.

الحميدي أبو بكر عبد الله بن الزبير القرشي الأسدي. (١٩٩٦م). المسند. ط١. تحقيق وتخريج: حسن سليم أسد الداراني. دمشق: دار السقا.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠هـ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض. دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧هـ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط ٢. تحقيق: حماد بن محمد الانصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط ١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة. دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط ١. تحقيق: يحي شفيق حسن. بيروت. دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط ١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت. عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم البستوي. المدينة المنورة. مكتبة الدار.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة:

الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

النسائي أحمد بن شعيب. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **السنن الصغري**. ط٢. تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة. حلب: مكتب المطبوعات الإسلامية.

النسائي أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبري**. ط١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

محمد وسیم اختر مفتی

السابقون الاولون من الانصار

(۵)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت عوف بن عفرا رضی اللہ عنہ

آباواجداد

حضرت عوف بن عفرا یثرب میں پیدا ہوئے۔ شاذ روایت میں ان کا نام عوذ بتایا گیا ہے۔ ان کے والد کا نام حارث بن رفاعہ تھا، لیکن وہ اپنی والدہ حضرت عفرا کی نسبت سے مشہور ہیں۔ مالک بن نجار ان کے ساتویں، خزرج قبیلے کے بانی خزرج بن حارثہ گیارھویں اور ازد بن غوث انیسویں جد تھے۔ نسبت قبیلہ سے خزرجی اور نسبت ایمانی سے انصاری کہلاتے ہیں۔

حضرت عوف کی والدہ حضرت عفرا بنت عبید بنو نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی پہلی شادی حارث بن رفاعہ سے ہوئی۔ حضرت معاذ اور حضرت معوذ کی پیدایش کے بعد حارث نے ان کو طلاق دے دی تو وہ حج کرنے مکہ آئیں۔ یہاں بنو عدی کے حلیف بکیر (یا ابو البکیر) بن عبد یالیل سے ان کا عقد ثانی ہو گیا اور حضرت عاقل، حضرت عامر، حضرت خالد اور حضرت ایاس کی ولادت ہوئی۔ اس کے بعد معلوم نہیں، ابو البکیر کی

وفات ہو گئی یا وہ ان سے علیحدہ ہو گئیں۔ تب حضرت عفرا مدینہ لوٹ آئیں اور اسلام قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لی۔ حارث نے رجوع کر کے دوبارہ ان سے نکاح کیا تو حضرت عوف کی ولادت ہوئی۔ (انساب الاشراف ۱/۲۸۱)۔ البتہ حارث بن رفاعہ کے قبول اسلام کی کوئی خبر نہیں۔ ابن اسحٰق نے حضرت رفاعہ کو بھی حضرت عوف کا بھائی بتایا ہے (الطبقات الکبریٰ، رقم ۱۶۳)۔

مکہ کے ناموافق حالات میں تعلیم و تبلیغ جاری رکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقم بن ابوارقم کے گھر منتقل ہوئے تو حضرت خالد بن بکیر، حضرت عاقل بن بکیر، حضرت عامر بن بکیر اور حضرت ایاس بن بکیر سب سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لے آئے۔ ان کے والد کے قبول اسلام کی کوئی اطلاع نہیں۔

قبول اسلام اور ۱۱ر نبوی کی بیعت

حضرت عوف بن عفرا انصار کے ان چھ السابقون الاولون میں شامل تھے جنھوں نے سب سے پہلے یثرب سے مکہ آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔ ۱۱ر نبوی (جولائی ۶۲۰ء) کے موسم حج میں آنے والے قبائل کو دعوت دین دینے کے لیے آپ منیٰ تشریف لائے تھے کہ آپ کی ملاقات بنو خزرج کے چھ افراد سے ہوئی۔ آپ نے انھیں قرآن مجید سنا کر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو وہ بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ یہودی جن خاتم النبیین کے ظہور سے ہمیں ڈراتے ہیں، یہی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے پہلے اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ سب ایمان لے آئے اور امید ظاہر کی کہ اگر یثرب کی ساری قومیں اوس اور خزرج آپ کی دعوت قبول کر لیں تو ان کی باہمی دشمنیاں ختم ہو جائیں گی۔ ان چھ خوش نصیبوں کے نام یہ ہیں: حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت عوف بن عفرا، حضرت رافع بن مالک، حضرت قطبہ بن عامر، حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت جابر بن عبداللہ بن رئاب۔ یثرب جا کر انھوں نے اپنے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو بھی اسلام کی دعوت دی۔

دوسری روایت کے مطابق ان چھ اصحاب کے ایمان لانے سے پہلے حضرت رافع بن مالک اور حضرت معاذ بن عفرا مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر کے اسلام قبول کر چکے تھے (البدایہ ۳/۳۹۹)۔

بیعت عقبۂ اولیٰ

۱۲ر نبوی (جولائی ۶۲۱ء): حج کے دوران میں ۱۱ر نبوی کی بیعت میں شامل پانچ اصحاب حضرت اسعد بن زرارہ،

حضرت عوف بن عفرا، حضرت رافع بن مالک، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت قطبہ بن عامر کے علاوہ حسب ذیل سات مزید اہل ایمان نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی:

حضرت معاذ (معوذ: بلاذری، ابن جوزی) بن عفرا، حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت یزید بن ثعلبہ، حضرت عباس بن عبادہ، حضرت ابوالہیثم مالک بن تیہان اور حضرت عویم بن ساعدہ۔ حضرت ابوالہیثم اور حضرت عویم اوس سے تھے، جب کہ باقی دس صحابہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ عقبہ کے مقام پر ہونے والی انصار کے ان بارہ السابقون الاولون کی بیعت، بیعت عقبۂ اولیٰ کہلاتی ہے۔

بیعت النساء

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش تھی کہ اسلام میں داخل ہونے والے ہر نئے مومن کا ایمان کامل ہو جائے، اخلاق حسنہ سے مزین ہو اور کبائر سے دور ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے یثرب کے ان اہل ایمان سے ان الفاظ میں بیعت لی: آؤ، اس بات پر میری بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، اپنے ہاتھوں پاؤں کے درمیان (اعضاے صنفی) سے متعلق کوئی بہتان نہ تراشو گے اور معروف میں میری نافرمانی نہ کرو گے۔ تم میں سے جو عہد پورا کرے گا، اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو گا اور جس نے ان میں سے کوئی عہد شکنی کی اور اللہ نے اس کا پردہ رکھا تو اس کا فیصلہ اللہ کرے گا، چاہے سزا دے، چاہے معاف کر دے (بخاری، رقم ۳۸۹۳۔ مسلم، رقم ۴۴۸۱۔ احمد، رقم ۲۲۷۵۴۔ مسند شاشی، رقم ۱۱۵۰)۔ اسے 'بیعت النساء' کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ جنگ فرض ہونے سے پہلے لی گئی اور اس کے الفاظ اس بیعت سے ملتے ہیں جو بعد میں صلح حدیبیہ کے موقع پر اللہ کے حکم پر عورتوں سے لی گئی (الممتحنہ ۶۰: ۱۲)۔

بیعت عقبۂ ثانیہ

۱۳ر نبوی (جون ۶۲۲ء): حج کے موقع پر جمرۂ اولیٰ کی گھاٹی میں پچھتر انصار نے اپنے بت پرست ساتھیوں سے چھپ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر جو بیعت کی، اسے بیعت عقبۂ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ موسم حج میں وہ اپنے مشرک اہل وطن کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے نکلے۔ راستے میں باہم مشورہ کرنے لگے کہ ہم کب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے پہاڑوں میں چکر کاٹتے، خوف زدہ رہنے دیں گے۔ مکہ پہنچ کر انھوں نے آپ سے درپردہ سلسلۂ جنبانی شروع کیا، آخر کار اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ وہ ایام تشریق کے درمیانی دن،

یعنی ۱۲؍ ذی الحجہ کو منیٰ میں جمرۂ عقبہ کی گھاٹی میں آپ کے پاس خفیہ طور پر جمع ہوں گے۔ تہائی رات گزر گئی تو تہتر مرد اور دو عورتیں سست روی سے چھپتے چھپاتے گھاٹی میں پہنچ گئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی اور عہد کیا کہ ہم لوگ آپ اور اسلام کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

بیعت الحرب

۱۲؍ نبوی کا سال گزرنے کے بعد حالات میں تبدیلی آئی اور اسلامی ریاست کے آثار نظر آنے لگے تو نصرت دین اور اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ضروری ہو گیا۔ چنانچہ بیعت عقبۂ ثانیہ میں جہاد اور مملکت اسلامیہ کے دفاع کی شقیں شامل کی گئیں، اس لیے اسے 'بیعت الحرب' کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیات تلاوت فرمائیں، اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور اسلام کی رغبت دلائی۔ صحابہ ایک ایک دو دو کر کے آپ کے پاس آئے اور آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ آپ نے فرمایا: میں تم سے بیعت لیتا ہوں، مستعدی اور کسل مندی میں سمع وطاعت کی، تنگی اور کشادگی میں انفاق کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی، اس بات کی کہ تم اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہو گے، اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرو گے، میری نصرت کرو گے جب میں تمھارے پاس آؤں گا، میرا دفاع کرو گے ان معاملات میں جن میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا دفاع کرتے ہو، بدلے میں تمھیں جنت ملے گی (احمد، رقم ۱۴۴۵۶، ۱۴۶۵۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۲۵۱۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۷۳۵۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۵۵۲۴۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۰۱۲)۔

حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت معاذ بن عفرا، حضرت عوف بن عفرا، حضرت معوذ بن عفرا، حضرت عمارہ بن حزم، حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت سہل بن عتیک، حضرت اوس بن ثابت، حضرت ابو طلحہ انصاری، حضرت قیس بن ابو صعصہ، حضرت عمرو بن غزیہ۔ ابن ہشام نے حضرت عوف کے چوتھے بھائی حضرت رفاعہ بن عفرا کو بھی بیعت عقبۂ ثانیہ کرنے والوں میں شمار کیا ہے۔

بت شکنی

مدینہ پہنچ کر حضرت عوف بن عفرا، حضرت اسعد بن زرارہ اور حضرت عمارہ بن حزم نے اپنے قبیلے بنو مالک بن نجار کے بت پاش پاش کر دیے۔

جنگ بدر

جنگ بدر ۱۷؍ رمضان ۲ھ (۱۳؍ مارچ ۶۲۴ء) میں مدینہ سے اسّی میل (ایک سو تیس کلو میٹر) دور بدر کے میدان میں لڑی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں تین سو تیرہ اہل ایمان ابو جہل کے لائے ہوئے ایک ہزار کفار کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور نصرت الٰہی سے فتح عظیم حاصل کی۔ حضرت عوف بن عفرا نے اس معرکۂ فرقان میں شہادت حاصل کی۔

جنگ کا سبب

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مدینہ کے پاس سے گزرنے والے تجارتی قافلوں کو ہدف بنانے کا فیصلہ کیا۔ جمادی الثانی ۲ھ (جنوری ۶۲۶ء) میں آپ نے قریش کی سرگرمیوں کی خبر لینے کے لیے حضرت عبد اللہ بن جحش کی سربراہی میں نو مہاجرین کا سریہ روانہ کیا۔ سریے میں شامل حضرت واقد بن عبد اللہ نے تیر مار کر قافلے کے سردار عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا۔ اس پر سرداران قریش مشتعل ہو گئے اور انتقام لینے پر تل گئے۔ چنانچہ یہی قتل جنگ بدر برپا ہونے کا اہم سبب بن گیا، دوسری وجہ یہ ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان بن حرب کی قیادت میں شام سے آنے والے تجارتی قافلے کو روکنے کے لیے ایک چھوٹا لشکر تیار کیا۔ ابو سفیان نے خطرہ بھانپ کر مدینہ سے دور سمندر کے قریب ایک لمبا اور محفوظ راستہ اختیار کر لیا، ساتھ ہی ضمضم بن عمرو کنانی کو مدد لانے کے لیے مکہ بھیج دیا۔ ابو جہل نے نو سو سے زیادہ مسلح افراد پر مشتمل لشکر تیار کیا اور بدر کا رخ کیا۔ اس اثنا میں ابو سفیان کا قافلہ خیر و عافیت سے مکہ پہنچ گیا، تاہم ابو جہل نے پیش قدمی جاری رکھی اور ۱۶؍ رمضان ۲ھ کے دن بدر کے میدان میں پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲؍ رمضان کو تین سو تیرہ جاں نثاروں کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ۱۷؍ رمضان کو میدان جنگ میں پہنچے۔

جنگ کا آغاز

میدان جنگ میں حضرت علی نے مہاجرین کا پرچم اٹھایا، جب کہ حضرت سعد بن عبادہ نے انصار کا پرچم تھاما۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے مشرک لیڈروں حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ نے سریۂ عبد اللہ بن جحش میں مارے جانے والے عمرو بن حضرمی کی دیت لے کر مکہ واپس لوٹنے کا مشورہ دیا۔ ابو جہل نے انھیں خوب طعن و تشنیع کی اور عمرو بن حضرمی کے بھائی عامر سے کہا کہ اپنے بھائی کا بین کر کے لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرو۔ عتبہ ابن حضرمی

کا حلیف تھا، اس لیے غیرت میں آ کر نکلا، کوئی خود پورا نہ آیا تو سر پر چادر لپیٹی اور اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور بیٹے ولید کو لے کر دوبدو مقابلے (duel) کے لیے پکارا۔ اس کے للکارنے پر انصار کے تین نوجوان حضرت عوف بن عفرا، حضرت معوّذ بن عفرا اور حضرت عبداللہ بن رواحہ (یا حضرت معاذ بن عفرا) آگے آئے اور بتایا: ہم انصاری ہیں۔ عتبہ بولا: ہمیں تم سے کچھ نہیں لینا دینا۔ محمد، ہماری قوم کے ہم سر بھیجو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سبقت کرنے والے انصار کو صفوں میں واپس جانے کو کہا اور فرمایا: اے بنی ہاشم، اٹھ کر مقابلہ کرو، اٹھو حمزہ، اٹھو عبیدہ بن حارث، اٹھو علی۔ تینوں نکل کر آئے تو عتبہ بولا: اب برابر کے، صاحب شرف لوگوں سے جوڑ پڑا ہے۔ اولاً اس نے اپنے بیٹے ولید کو بھیجا، حضرت علی اس کے مقابلے پر آئے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر تلوار سے وار کیا۔ ولید کا وار خالی گیا، جب کہ حضرت علی نے ایک ہی ضرب میں اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر شیبہ آگے بڑھا اور حضرت حمزہ اس کا سامنا کرنے نکلے۔ ان دونوں میں بھی دو ضربوں کا تبادلہ ہوا اور شیبہ جہنم رسید ہوا۔ اب عتبہ کی باری تھی، حضرت عبیدہ بن حارث سے اس کا دوبدو مقابلہ ہوا، دونوں نے ایک دوسرے پر کاری ضربیں لگائیں۔ حضرت عبیدہ کی پنڈلی پر تلوار لگی اور ان کا پاؤں کٹ گیا۔ حضرت حمزہ اور حضرت علی پلٹ کر عتبہ پر پل پڑے، اسے جہنم رسید کیا اور زخمی حضرت عبیدہ کو اس حال میں اٹھا کر لے آئے کہ ان کی ٹانگ کی نلی سے گودا بہ رہا تھا۔ ان کی شہادت اسی زخم سے ہوئی۔ قریش نے اپنے نام ور سرداروں کو یوں کٹتے دیکھا تو یک بارگی حملہ کر دیا تاکہ اکثریت کے بل بوتے پر لشکر اسلام کو شکست دیں۔ حضرت واقد بن عبداللہ جنھوں نے عمرو کو قتل کیا اور حضرت عبداللہ بن جحش جو اس مہم کے امیر تھے، مشرکوں کا ٹارگٹ تھے۔ اللہ کا کرنا ہے کہ اس غزوہ میں دونوں ان کے ہاتھ نہ آ سکے۔

داد شجاعت

حضرت عوف بن عفرا اور ان کے بھائیوں حضرت معاذ بن عفرا اور حضرت معوذ بن عفرا نے جنگ بدر میں بھرپور شرکت کی۔ ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ حضرت عوف بن عفرا کے چوتھے بھائی حضرت رفاعہ بن عفرا بھی معرکۂ فرقان میں شامل تھے (السیرۃ النبویۃ ۲/۶۷۔ طبقات ابن سعد، رقم ۱۶۳)۔ دوسرے ذرائع سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ان بھائیوں کی شجاعت کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔ انھیں الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔

پہلی روایت: جنگ کی صف میں حضرت معاذ بن عمرو بن جموح اور حضرت معاذ بن عفرا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ایک نے پوچھا: چچا، آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں؟ وہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی شان میں گالیاں بکتا ہے۔ اگر میں اس کو دیکھ لوں تو اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک کہ وہ مر نہ جائے یا میں شہید نہ ہو جاؤں۔ دوسرے نے بھی ایسی ہی گفتگو کی۔ حضرت عبدالرحمٰن نے ابو جہل کو مشرکوں کے بیچ گھومتے پھرتے دیکھ لیا تو اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ دونوں مجاہد تلواریں لے کر اس کی طرف لپکے اور پے در پے وار کر کے اسے قتل کر دیا۔ پھر دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابو جہل کے انجام کی خبر دی۔ آپ نے سوال فرمایا: تم میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے؟ دونوں بولے: میں نے قتل کیا ہے۔ آپ نے پوچھا: کیا تم نے اپنی تلواریں پونچھ لی ہیں؟ عرض کیا: نہیں۔ آپ نے تلواروں کو ملاحظہ کر کے فرمایا: تم دونوں نے اسے جہنم رسید کیا ہے، لیکن اس کا چھوڑا ہوا مال غنیمت (تلوار اور سامان حرب) معاذ بن عمرو کو ملے گا (بخاری، رقم ۳۱۴۱۔ مسلم، رقم ۳۹۸۸۔ احمد، رقم ۱۶۷۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۷۹۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۸۴۰۔ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۸۶۷)۔ کیونکہ انھوں نے پہلے وار کیا اور زیادہ گہری چوٹ لگائی۔ تمام قاتلوں کے غنیمت میں شریک ہونے کا حکم غزوۂ بدر کے سات سال بعد جنگ حنین میں ارشاد ہوا (فتح الباری: شرح حدیث، رقم ۳۰۴۰۔ ابن حبان، رقم ۴۸۴۰)۔

دوسری روایت: ابو جہل گھوڑے پر سوار تھا اور اسے مشرکوں نے حصار میں لے رکھا تھا، حضرت معاذ بن عمرو نے موقع پا کر اس کی ٹانگ پر وار کیا اور اس کی پنڈلی کاٹ دی۔ ابو جہل کے بیٹے عکرمہ نے ان کے کندھے پر جوابی وار کیا، جس سے ان کا کندھا کٹ کر پہلو سے لٹکنے لگا۔ انھوں نے اسے اتار پھینکا (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۲۶۷)۔ ابن عبدالبر نے اس عمل کو حضرت معاذ بن عفرا کی طرف منسوب کیا ہے (الاستیعاب ۱۴۰۹)۔ ابن حجر کا رجحان بھی یہی ہے (الاصابہ، رقم ۸۰۵۴)، تاہم ابن سعد نے اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اتنے میں حضرت معوذ بن عفرا آ پہنچے، انھوں نے بھی ابو جہل پر کاری ضربیں لگائیں، پھر وہ لڑتے لڑتے آگے نکل گئے اور شہید ہو گئے (اسد الغابہ ۴/۳۸۱)۔ دوران جنگ میں حضرت عوف نے بھی شہادت پائی۔

تیسری روایت: بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون دیکھے گا، ابو جہل کس حالت میں ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے تعمیل فرمان کی۔ انھوں نے دیکھا کہ حضرت عفرا کے دونوں بیٹوں نے اسے گھائل کر دیا ہے، حتیٰ کہ وہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ انھوں نے اس کی ڈاڑھی پکڑ کر کہا: یہ تو ہے، ابو جہل، گم راہ سردار؟ ابو جہل بولا: کیا تمھارے قتل کیے ہوئے لوگوں میں کوئی مجھ سے بلند رتبہ بھی ہے؟ (بخاری، رقم ۳۹۶۳۔ مسلم، رقم ۴۶۸۵۔ احمد، رقم ۱۳۴۷۷۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۸۱۶۵)۔ ابن حجر کہتے ہیں: حضرت عفرا

کے دونوں بیٹوں سے مراد حضرت معاذ اور حضرت معوذ ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے ابو جہل کی تلوار ہی سے اس کا سر قلم کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کر دی۔

چوتھی روایت: حضرت عوف بن عفرا اور حضرت معاذ بن عفرا، دونوں بھائیوں نے ابو جہل پر وار کر کے اسے زخمی کیا، لیکن گرنے سے پہلے وہ ان دونوں کی طرف مڑا اور جوابی وار کر کے انھیں شہید کر دیا (کتاب المغازی، واقدی ۱/۱۴۹۔ المنتظم، ابن جوزی ۷۶۶)۔ ابن سیرین نے اس روایت کی تائید کی۔

پانچویں روایت: حضرت معاذ بن عمرو، حضرت معوذ بن عفرا اور حضرت عوف بن عفرا نے تلواروں کے وار کر کے ابو جہل کو ادھ موا کیا اور حضرت عبد اللہ بن مسعود نے اس کا کام تمام کیا (طبقات ابن سعد، رقم ۱۶۳۔ بحار الانوار، مجلسی ۱۹/۳۶۳)

چھٹی روایت: غزوۂ بدر کے دن حضرت عوف بن عفرا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: بندے کی کون سی بات اس کے رب کو خوش کرتی ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ بات کہ اس کا ہاتھ جنگ میں مصروف ہو اور زرہ کے بغیر بے خوف لڑ رہا ہو، یعنی اگر جنگ کے میدان میں ہے تو پھر بے خوف ہونا چاہیے۔ اس پر حضرت عوف بن عفرا نے اپنی زرہ اتار پھینکی، تلوار پکڑی اور آگے بڑھ کر لڑنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ شہید ہو گئے (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۶۷۷۔ السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام ۲/ ۲۰۳)۔

حضرت عوف کے چاروں سوتیلے بھائیوں حضرت خالد بن بکیر، حضرت عاقل بن بکیر، حضرت عامر بن بکیر اور حضرت ایاس بن بکیر نے بنو عدی کے حلفا کی حیثیت سے جنگ بدر میں شرکت کی اور حضرت عاقل نے شہادت کا اعزاز حاصل کیا۔

شہادت

بلاذری کہتے ہیں: حضرت معاذ بن عفرا اور حضرت معوذ بن عفرا نے غزوۂ بدر میں شہادت پائی، جب کہ حضرت عوف بن عفرا زندہ رہے اور عہد معاویہ میں وفات پائی۔ اپنے بیٹوں کی شہادت کے بعد حضرت عفرا بنت عبید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا: یارسول اللہ، یہ میرا سب سے گزرا ہوا بیٹا ہے۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہیں، عفرا کی باقی نسل عوف ہی سے چلے گی۔ اس کے برعکس واقدی نے بتایا ہے: حضرت عوف بن عفرا اور حضرت معوذ بن عفرا جنگ بدر میں شہید ہوئے، انھیں ابو جہل نے قتل کیا۔ حضرت معاذ بن عفرا زندہ رہے اور زمانۂ فتنہ میں وفات پائی (الانساب ۱/ ۲۸۱)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عفرا کے بیٹوں کی جاے شہادت پر آئے اور فرمایا: اللہ ان دونوں پر رحم فرمائے، انھوں نے اس امت کے فرعون کو قتل کرنے میں حصہ لیا۔

مطالعۂ مزید: کتاب المغازی (واقدی)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، انساب الاشراف (بلاذری)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

تفسیر ''مفتاح القرآن'' کا ایک علمی مطالعہ

(۲)

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

قدیم و جدید مفسرین سے استفادہ

مفسر گرامی قدیم مفسرین میں امام رازی، طبری، ابن کثیر، زمخشری، ابو حیان اندلسی اور ابو مسلم اصفہانی سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور اس بارے میں وہ کسی مسلکی و مشربی تعصب سے کام نہیں لیتے۔ زمخشری اور ابو مسلم اصفہانی، دونوں معتزلی ہیں، مگر دونوں کے ہاں فہم قرآن کا جو ذوق ہے، وہ بہت بلند ہے، اس لیے ان دونوں سے وہ کافی استفادہ کرتے ہیں۔ مگر متاخر مفسرین پر وہ زیادہ تر نقد ہی کرتے ہیں، خاص کر ''تفسیر مدارک'' اور ''تفسیر خازن'' کے مصنفین پر۔ اردو ترجموں کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہ تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجمہ و تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا تھانوی کو نہ معلوم کیوں تفسیر روح المعانی بہت پسند آگئی تھی۔ جو رطب و یابس اور فضولیات سے بھری ہوئی کتاب ہے۔ مجموعی لحاظ سے مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن اردو تفسیروں میں پسندیدہ تر ہونے کے لائق ہے۔[۱۴]''

۱۴۔ اردو مترجمین و مفسرین کے بارے میں علامہ میرٹھی نے یہ رائیں اپنے ایک غیر مطبوعہ مختصر سے مضمون ''اردو

اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت قرآنی کو بھی سراہا ہے۔[15] علامہ حمید الدین فراہی سے بہت سی باتوں میں اختلاف رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل پر انھوں نے علمی نقد کیا اور سلف کی تفسیر کی تائید کی ہے۔ تاہم ان کے بارے میں بلند کلمات لکھے ہیں:

''مولانا حمید الدین فراہی صاحب فکر و بصیرت عالم تھے،... بہر حال قرآن کریم ان کے فکر و نظر کا موضوع تھا، موصوف نے یہی مبارک روح سرائے میر (اعظم گڑھ) کی مشہور عربی درس گاہ مدرسۃ الاصلاح میں پھونک دی تھی۔''[16]

اردو تفسیروں میں علامہ میرٹھی نے سرسید، چودھری غلام احمد پرویز کے علاوہ متعدد مواقع پر ''تفہیم القرآن'' پر بھی نقد کیا ہے، حالاں کہ وہ مولانا مودودی کے عصری فہم و بصیرت و عظمت کے قائل تھے، مگر علوم اسلامیہ، خاص کر تفسیر و حدیث کے میدان میں ان کے چنداں قائل نہ تھے۔[17]

آیات و سور کا باہمی ربط

مفسر گرامی نے سورہ و آیات کے باہمی ربط و تعلق پر بھی جابجا روشنی ڈالی ہے، مثال کے طور پر سورۂ نور اور سورۂ مومنون کے باہمی ربط کو ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

''سورۂ مومنون کے شروع میں مذکور ہے کہ عفت و پارسائی سے متصف ہونا مومن کی شان ہے اور یہ وصف ان چھ اوصاف میں سے ہے جو فوز و فلاح کا سبب ہیں اور سورۂ نور میں عفت و پارسائی کی تاکید مذکور ہے اور اس کی حفاظت کی سلبی اور ایجابی تدبیریں ارشاد ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے سورۂ نور کا بیش تر حصہ سورۂ مومنون کی آیت ۶ 'وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ' کی شرح و تفسیر ہے۔''[18]

میں لکھی گئی تفاسیر قرآن'' میں ظاہر کی ہیں۔ یہ مضمون اپنی اصل صورت میں راقم کے پاس محفوظ ہے۔

15۔ علامہ میرٹھی لکھتے ہیں: ''مولانا عبدالماجد دریابادی نے عربی نہ جاننے کے باوجود قرآن کریم کی خدمت احتیاط سے کی ہے۔ ترجمہ و تفسیر میں ان علماے کرام کی باتیں نقل کی ہیں جو ان کے نزدیک علم و تقویٰ میں معتمد علیہ تھے۔''

16۔ حوالۂ بالا۔

17۔ حوالۂ بالا۔

18۔ معاصر تفسیروں میں مصنف نے سب سے زیادہ نقد ''تفہیم القرآن'' پر ہی کیا ہے۔

ہر سورہ مرتب و منظم نازل ہوئی

نظم قرآنی کے سلسلہ میں صاحب ''مفتاح القرآن'' کی رائے یہ ہے کہ ہر سورہ اسی ترتیب سے اتری ہے جس ترتیب سے وہ درج مصحف ہے۔ یہ تو ہوا ہے کہ کوئی سورہ پہلے نازل ہوئی ہو، اسے مصحف میں بعد میں درج کیا گیا ہو، مگر ایسا نہیں ہوا کہ ایک ہی سورہ کی آیات میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو۔ نہ ہی ایسا ہوا ہے کہ کوئی آیت یا کوئی سورہ کئی بار نازل ہوئی ہو۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''حق و صحیح بات یہ کہ دیگر دوسری سورتوں کی طرح سورۂ آل عمران کی آیات بھی اسی ترتیب کے ساتھ نازل ہوئی تھیں جس ترتیب سے وہ درج مصحف ہیں۔ بے شک قرآن کریم کی سورتوں میں زمانی ترتیب نہیں ہے۔ چنانچہ چار ابتدائی سورتیں، سورۂ بقرہ، وآل عمران و سورۂ نساء و سورۂ مائدہ مدنیہ ہیں پھر سورۂ انعام و سورۂ اعراف دونوں مکیہ ہیں۔ لیکن یقین کرنا چاہیے کہ ہر سورہ شریفہ کی آیات میں زمانی ترتیب ہے۔ ان میں عدم ترتیب کا خیال کرنا، یعنی یہ سمجھنا کہ کسی سورۃ میں بعد میں نازل ہونے والی آیات پہلے اور پہلے نازل ہونے والی آیات بعد میں درج مصحف ہیں بالکل غلط ہے۔ کسی سورۃ کی آیات میں ترتیب زمانی نہ ہونے کا غلط و بیہودہ خیال دراصل اہل رفض کا تراشیدہ ہے۔ خاص مقصد، یعنی صحابۂ کرام کو مطعون کرنا ان کے پیش نظر تھا۔ غیر محتاط راویوں نے یا تقیہ اختیار کر کے رافضیوں نے ہی اہل سنت میں اس خیال کو قوت پہنچانے والی روایات پھیلائی ہیں۔''[19]

اس رائے کا اظہار علامہ نے اور بھی متعدد جگہوں میں کیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی شان نزول میں مولانا مودودی نے چار تقریریں قرار دی ہیں۔[20] اس پر نقد کرتے ہوئے علامہ میرٹھی لکھتے ہیں:

> ''سوال یہ ہے کہ یہ سورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کب تعلیم فرمائی تھی اور کاتبان وحی سے کب لکھوائی تھی؟ کیا تکمیل نزول کے بعد سنہ ۹ھ میں جب وہ تقریر نازل ہو چکی ہے جسے مودودی صاحب اس سورہ کی تقریر ۲ بتا رہے ہیں اور جس کا زمانۂ نزول ۹ھ قرار دے رہے ہیں؟ یا جیسے جیسے اس کی آیات نازل ہوتی رہیں آپ صحابہ کو تلقین فرماتے اور کاتبان وحی سے لکھواتے رہے؟ یقیناً پہلی صورت نہیں ہوئی نہ ہی کوئی شخص اس کا قائل ہے، دوسری ہی صورت تھی، یعنی جو آیات نازل ہوئیں فوراً ان کی تلقین بھی فرمادی گئی

۱۹۔ مفتاح القرآن ۲/۴، فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی، ۲۰۲۴ء۔

۲۰۔ تفہیم القرآن ج ۱، دیباچہ تفسیر آل عمران۔

اور کاتبانِ وحی سے وہ لکھوا دی گئیں۔ پس مولانا مودودی کے خیالِ مذکور کو مان لینے سے لازم آتا ہے کہ اہلِ ایمان سنہ ۴، ۵، ۶، ۷، اور سنہ ۸ تک پورے پانچ سال تک اس سورہ کو اس طرح پڑھتے رہے ہوں کہ چوتھے رکوع کی دو آیتوں کے بعد 'قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ ۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ' (آل عمران ۳: ۶۴) پڑھتے ہوں جو اس سورہ کا ساتواں رکوع ہے اور اسی طرح لکھنے والوں نے لکھا ہو، پھر جب سنہ ۹ میں یہ آیات جنھیں (مولانا) مودودی صاحب نے اس سورت کی دوسری تقریر بتایا ہے، اتری ہوں تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بتایا ہو کہ یہ سورہ جو تمھیں محفوظ ہے یا تمھارے پاس بصورت مکتوب موجود ہے تو اس میں فلاں آیت اور فلاں آیت کے درمیان یہ آیات اور یاد کر لو اور لکھ لو، یہ لازم آنے والی بات یقیناً غلط ہے۔ لامحالہ جس بات سے یہ غلط بات لازم آرہی ہے وہی غلط ہے۔" (مفتاح القرآن ۱/ ۵۸۳)

حروف مقطعات

حروف مقطعات کے بارے میں مفسرین کا عام رجحان یہ ہے کہ ان کے معانی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔ اور ان کو معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مگر بعض مفسرین نے، اس کے برخلاف ان کے معانی متعین کرنے کی کوشش بھی فرمائی ہے۔ اردو میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس کی کوشش کی ہے۔[۲۱] علامہ میرٹھی بھی اسی گروہ علما سے تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے حروف مقطعات میں ہر ایک کے معنی و مفہوم کو متعین کیا ہے اور ان کو سورۂ بقرہ کے شروع میں جمع کر دیا ہے۔ اور یہ بحث ان کی تفسیر میں ۷ صفحات تک چلی گئی ہے اور پوری بحث پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بحث کے آغاز کے چند جملے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

"'الٓمّٓ'۔ اِس سورۂ شریفہ کا عنوان ہے۔ اور یہ ہی اس کے بعد کی سورہ یعنی سورۂ آل عمران کا پھر سورۂ عنکبوت و سورۂ روم و سورۂ لقمان و سورۂ سجدہ کا بھی عنوان ہے۔ اس طرح اور بھی متعدد سورتوں کے عناوین ایسے ہی رکھے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں اِس انداز کی سورتیں انتیس ہیں، ان میں سے دو ـــــ سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران ـــــ مدنیہ ہیں اور بقیہ سب مکیہ ہیں۔ اِن عناوین کو اصطلاح میں حروف مقطعات کہتے ہیں، کیونکہ ان کا تلفظ حروف ہجاء کے طور پر پورا پورا اور الگ الگ کیا جاتا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قراءت اسی طرح ثابت و منقول ہے۔ مثلاً 'الٓمّٓ' کو الف لام میم پڑھا جاتا ہے۔ ان حروف مقطعات میں فی الواقع ان مضامین و مطالب کی طرف اشارات فرمائے گئے ہیں جن کا ان سورتوں میں ذکر ہے۔......

۲۱۔ مفتاح القرآن ۱/ ۵۸۱۔

۱۔ صٓ: اس سورۂ شریفہ کے آغاز میں ہی ذی اثر کافروں کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: 'امۡشُوۡا وَاصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمۡ' (صٓ ۳۸: ۶) (اپنے قدیم مسلک و مذہب پر چلتے رہو اور اپنے معبودوں اور دیوتاؤں پر جمے رہو) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق میں جدوجہد کو دیکھ کر اُن لوگوں نے باہم یہ طے کیا تھا اور اپنے عوام کو یہ پیغام دیا تھا کہ اس دعوت توحید کو بالکل ناکام بنا دو، صبر وثبات اور استقلال کے ساتھ اپنے دھرم پر قائم رہو۔ اس کے بعد ان کی اور چند بے ہودہ و گستاخانہ باتیں نقل کر کے اور انھیں زجر و توبیخ فرما کر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے: 'اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ' (صٓ ۳۸: ۱۷) یعنی آپ ان کی باتوں پر صبر فرمائیں اور اپنے کام میں لگے رہیں اور تسلی کے لیے گذشتہ انبیاے کرام علیہم السلام کی سیرت صبر وثبات پیش نظر رکھیں۔ اس کے بعد ان حضرات کے صبر وثبات اور اس کے مختلف مظاہر کو پیش کیا ہے۔ پھر چوتھے رکوع کے آخر میں حق پر صبر کرنے والوں اور باطل سے چمٹے رہنے والوں کے الگ الگ اور متضاد اخروی انجام کا ذکر کیا ہے۔ پھر پانچویں رکوع میں باطل پر صبر کرنے والوں کے سب سے بڑے لیڈر اور پیشوا، یعنی ابلیس اور اس کے انجام بد کا ذکر ہوا ہے۔ پس اس سورۂ شریفہ کا مرکزی و بنیادی مضمون صبر ہے اور اس میں نہایت بلیغ و دل نشین انداز سے صبر علی الحق اختیار کرنے اور صبر علی الباطل کو چھوڑ دینے کی ترغیب و تاکید فرمائی گئی ہے۔ اور حرف صاد کو اس کا عنوان و علم قرار دے کر اس کے اس موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے''۔ الخ[۲۲]

حروف مقطعات کی بحث کے اخیر میں انھوں نے لکھا ہے:

''پھر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ حروف مقطعات کو سورتوں کے عنوان و عَلم کے طور پر استعمال کرنا قرآن کریم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت اور اس کے معجزانہ تفردات میں سے ایک تفرد ہے۔ کلام عرب میں حروف مقطعات کو اس طرح استعمال کرنے کی کوئی نظیر ثابت نہیں... واقعہ یہ ہے کہ یہ اسلوب نہ تو نزول قرآن سے پہلے معروف تھا نہ نزول قرآن کے وقت رائج تھا، اس لیے اس کا متروک

۲۲۔ مولانا امرتسری لکھتے ہیں:

''ان حروف کے معنی بتلانے میں بہت ہی اختلاف ہوا... میرے نزدیک زیادہ صحیح معنی وہ ہیں جو ابن عباس سے مروی ہیں کہ ہر حرف اللہ کے نام اور صفت کا مظہر ہے۔ اس لیے میں نے، یہ ترجمہ جسے آپ دیکھ رہے ہیں، کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس سے منقول ہے۔ مثال کے طور پر بعض حروف مقطعات کا ترجمہ یوں کیا ہے 'الٓمٓ': میں ہوں اللہ سب سے بڑا علم والا، 'الٓرٰ': میں ہوں اللہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا۔'' (تفسیر ثنائی ۳/ ۴۶)

ہو جانا بے معنی بات ہے۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے وقت صحیح و فصیح عربی میں ادائے مطالب کے جو اسالیب رائج و معروف تھے وہ تمام کے تمام بلا استثنا قرآن کریم کی بدولت صحیح و فصیح عربی زبان میں اب بھی معروف و رائج ہیں اور جب تک روے زمین پر قرآن باقی ہے معروف و رائج رہیں گے۔‘‘(مفتاح القرآن ۱/ ۳۸)

لغوی دقائق

مفسر رحمہ اللہ عربی زبان وادب، لغت واشتقاق، نحو وصرف اور بلاغت میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ لغوی دقائق اور نکتہ سنجیوں تک بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں۔ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ان علوم پر بھی مجتہدانہ نظر رکھتے ہیں۔لہٰذا آیات کی تفسیر کے بعد تنبیہ کے عنوان سے جہاں بھی کوئی فنی، ادبی، لغوی یا حدیثی تحقیق پیش کرتے ہیں، ان میں وہ اکثر جگہوں میں نہایت اطمینان بخش راے دیتے ہیں۔ عقلی ووجدانی طور پر قاری ان کی بات سے مطمئن اور سابق مفسرین کی راے سے غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ مفسر گرامی قرآن پر مسلسل غور و فکر اور تدبر کرتے تھے، لہٰذا اس تدبر اور غور فکر سے ان پر نت نئے معانی اور تحقیقات کا انکشاف ہوتا رہتا تھا، گویا وہ کیفیت تھی کہ:

ترے ضمیر پہ نہ ہو جب تک نزول کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

مثال کے طور پر آیت کریمہ ’حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡهَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَاَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ وَمَنۡ اٰمَنَ‘(ہود ۱۱: ۴۰)کا ترجمہ یوں کیا ہے:

’’یہاں تک کہ جب آجائے گا ہمارا حکم اور ابل پڑے گا تنور تو ہم فرمائیں گے کہ سوار کر لے اس میں ہر ایک نوع سے نر و مادہ کو یعنی دو فرد کو اور اپنے گھر والوں کو اُس کے سوا جس کی تباہی کا حکم صادر ہو چکا ہے۔اور اس گروہ کو جو ایمان لے آیا ہے۔اور اس قوم میں تھوڑے ہی لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ ہوئے تھے۔‘‘

آگے تنبیہات کے عنوان سے لکھتے ہیں:

’’اس ترجمہ وتفسیر سے ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ آیت ’وَاصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡیُنِنَا وَوَحۡیِنَا وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا‘(ہود ۱۱: ۳۷) سے مرتبط ہے۔اس آیت کا ترجمہ کرنے میں دیگر مفسرین و مترجمین سے چوک ہوگئی ہے،انھوں نے ’حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ‘(ہود ۱۱: ۴۰) کا ترجمہ یہ

کیا ہے: یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور نے جوش مارا تو ہم نے کہا'' حالاں کہ لفظ 'اذا' اس ترجمہ کی صحت سے مانع ہے۔ اگر 'اذا' کی بجاے 'لما' یا 'اذ' ہوتا تو یہ ترجمہ درست ہوتا کیونکہ 'اذا' کلمۂ استقبال ہے ماضی کو بھی مضارع کے معنی میں کر دیتا ہے، ان مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ کرتے وقت سورۃ المومنین کی اِس آیت کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا تو غلطی سے بچ جاتے: 'فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ' (المومنون: ۲۷)۔'' (مفتاح القرآن ۱۱۵/۳)

لوح محفوظ کی تحقیق

قرآن میں متعدد جگہ کتاب مبین یا روز نامچۂ خداوندی کا تذکرہ آیا ہے، جو تمام حوادث وواقعات عالم کو محیط ہے اور جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مفسر گرامی نے اس کتاب مبین کی متعدد آیات کے تتبع سے تین قسمیں کی ہیں۔ (الف) منصوبۂ کائنات جو تخلیق کائنات سے بہت پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کے علاوہ صحیح مسلم کی ایک حدیث بھی ناطق ہے۔ (ب) عالم میں رونما ہونے والے حوادث وواقعات کا تفصیلی رجسٹر جیسا کہ متعدد آیات کریمہ بتاتی ہیں۔ (ج) ہر شخص کا نامۂ اعمال، متعدد آیات میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن نیک بندوں کو یہی نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں ملے گا اور کفار فجار کو بائیں ہاتھ میں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

''پس قرآن مجید سے اندراجات کی یہ تینوں قسم کی کتابیں ثابت ہیں، لیکن تعجب ہے کہ جمہور مفسرین کو ان میں تمیز کی توفیق نہیں ملی۔ انھوں نے قسم اول وثانی پر دلالت کرنے والی آیات میں ہر جگہ کتاب کو ''لوح محفوظ'' سے تعبیر کیا ہے۔ اور لوح محفوظ کے متعلق یہ تصور دیا ہے کہ وہ ایک کتاب عظیم ہے جس میں دنیا بھر کی ہر چیز بے کم وکاست عالم کی آفرینش سے پہلے ہی درج کر دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ تمام بندوں کے اچھے برے اعمال وافعال اور انھیں پیش آنے والے تمام احوال سب اس میں ثبت ہیں۔ جتنے صحیفے انبیاء کرام پر نازل ہوئے قرآن کریم سمیت سب اس میں پہلے سے ہی لکھ دیے گئے تھے۔ یہ لوح زمرد کی ہے، اس کا طول ۵۰۰ سال کی مسافت کا ہے اور عرض ۱۰۰ سال کی مسافت کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مزعومہ لوح محفوظ کا ذکر نہ تو قرآن کریم میں کہیں ہے نہ کسی حدیث صحیح میں...۔'' (مفتاح القرآن ۳۸۲/۲)

تفسیر القرآن بالقرآن

ڈاکٹر سید شاہد علی کی تحقیق کے مطابق: ''آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں آپ تفسیر القرآن بالقرآن کے طرز کی مکمل پیروی کرتے ہیں۔ آپ کی زیادہ تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ آپ ایک آیت کی دوسری آیات کی مدد سے تفسیر کریں، مزید یہ کہ دوسری آیات کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کی بھی تشریح وتوضیح کردیتے ہیں۔ جس سے موضوع کا پورا احاطہ ہو جاتا ہے اور سلف صالحین کے مسلک کی مکمل پیروی بھی ہوتی ہے۔ 'وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ' (اور جو دنیا کے فائدے کو مقصود بنائے تو ہم اسے دنیا سے دے دیتے ہیں اور جو آخرت کے فائدہ کو مقصود بنائے تو ہم آخرت سے عطا فرماتے ہیں اور شکر کرنے والوں کو ہم جزا عطا فرمائیں گے)۔''[۲۳]

[باقی]

۲۳۔ ڈاکٹر سید شاہد علی، اردو تفسیروں کا مطالعہ بیسویں صدی میں ۱۱۰۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

فقہی منہاج میں استدلال کے سقم اور اہل فلسطین کے لیے استطاعت کی شرط

استدلال کے منہاج میں سقم کن غیر معقول نتائج تک لے جا سکتا ہے، ذیل میں فقہ سے اِس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ یہ حدیث سے غلط استدلال کا ایک نمونہ ہے۔ ایسے بیسیوں مسائل ہماری فقہ کو لاحق ہیں۔ اِس سے یہ بھی واضح ہو گا کہ

۱۔ فکر غامدی میں استدلال کی بنیادوں کی تنقیح کیوں اہم ہے۔

۲۔ حدیث کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف کیوں درست ہے۔

۳۔ نظم کلام سے فہم کلام کے حقیقی مفہوم تک رسائی کا منہاج کیونکر ایک درست طرز فہم ہے۔

۴۔ کلام اپنے لسانی اور عقلی مضمرات کے ساتھ صادر ہوتا ہے۔

۵۔ کلام کا تاریخی پس منظر بھی نظم کلام میں شامل ہوتا ہے۔

متن فہمی کے یہ مسلمہ اصول اگر قرآن اور حدیث کی تفہیم میں نہ برتے جائیں تو نتائج کس قدر غلط پیدا کیے جا سکتے ہیں، یہ درج ذیل مثال سے واضح ہو گا۔

غامدی صاحب کا موقف ہے کہ احادیث دین کا مستقل ماخذ نہیں ہیں۔ دین کے مستقل ماخذ قرآن اور سنت متواترہ ہیں، جو اجماع و تواتر کے قطعی ذرائع سے ملے ہیں۔ احادیث اخبار آحاد کی صورت میں منتقل ہوئی ہیں، اِس لیے یہ ایک ظنی ذریعۂ علم ہیں۔ یہ اپنے سیاق و سباق کے ساتھ، بالعموم بیان نہیں ہوتیں، اِس لیے

اِنھیں علم اور عقل کے مسلمات کی روشنی میں رکھ کر سمجھا جائے گا۔احادیث میں اصل دین کی تبیین و تشریح، اُس کے اصولوں کا اطلاق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، آپ کی سیرت و سوانح کا بیان ہوتا ہے۔اِن میں کوئی مستقل حکم بیان نہیں ہوتا۔اِن سے قرآن کے کسی حکم میں نسخ اور تبدیلی نہیں ہوتی۔

اِس کے برعکس، فقہا احادیث کو ایک ظنی ماخذ تسلیم کرنے کے باوجود دین کے مستقل احکام اخذ کرنے کا ایک ذریعہ مانتے ہیں اور اُن سے قرآن کے حکم میں نسخ و تبدیلی کے بھی قائل ہیں۔ متن میں لسانی اور عقلی تقییدات عائد کرنے میں بھی اُن کے ہاں سقم پائے جاتے ہیں۔

اب محولہ مسئلے کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کا بارہ ہزار کا لشکر مغلوب نہیں ہو سکتا۔پوری روایت یہ ہے:

عن ابن عباس، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «خَيْرُ الصَّحَابَةِ أَرْبَعَةٌ، وَخَيْرُ السَّرَايَا أَرْبَعُ مِائَةٍ، وَخَيْرُ الْجُيُوشِ أَرْبَعَةُ آلَافٍ، وَلَنْ يُغْلَبَ اثْنَا عَشَرَ أَلْفًا مِنْ قِلَّةٍ». قَالَ أَبُو دَاوُدَ : وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ مُرْسَلٌ. (ابوداؤد، رقم ۲۶۱۱)

”عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر ساتھی وہ ہیں جن کی تعداد چار ہو، اور چھوٹی فوج میں بہتر فوج وہ ہے جس کی تعداد چار سو ہو، اور بڑی فوجوں میں بہتر وہ فوج ہے جس کی تعداد چار ہزار ہو، اور بارہ ہزار کی فوج قلت تعداد کی وجہ سے ہرگز مغلوب نہیں ہو گی۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے۔“

یہ ایک مرسل حدیث ہے۔اِس کی سند سے قطع نظر، روایت کو متن فہمی کے درج بالا اصولوں کی روشنی میں سمجھا جائے تو اِس کا درست مفہوم متعین کرنا دشوار نہیں ہے۔اِسے اِس کے تاریخی پس منظر میں دیکھیے۔

عرب میں راستے دشوار اور غیر محفوظ تھے، اِس صورت حال میں یہی مشورہ دیا جانا چاہیے تھا کہ کم از کم دو چار لوگ مل کر سفر پر نکلیں۔دوسرے یہ کہ عرب کے متفرق قبائل کے مقابلے میں سب سے بڑی جنگی قوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو گئی تھی، جو مختلف قبائل پر مشتمل تھی۔ ہم سایہ قبائل سے چھوٹی جھڑپوں اور عرب کے بڑے قبائل سے باقاعدہ جنگوں کا سلسلہ جاری تھا۔اِس تناظر میں رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے کسی موقع پر اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی یا اُن کی تنبیہ کے لیے فرمایا کہ عرب کے قبیلوں کی بکھری ہوئی طاقت کے مقابل چھوٹی جھڑپوں کے لیے چار سو اور بڑی جنگ کے لیے چار ہزار اور پھر بارہ ہزار ایک بڑا لشکر ہے، جو اِن متفرق قبائل سے مغلوب نہیں ہو سکتا یا اسے مغلوب نہیں ہونا چاہیے۔

روایت میں وارد اِس بیان سے فقہا نے اپنے اصول فقہ کے مطابق ایک مستقل حکم بر آمد کر لیا کہ اگر مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار ہو تو وہ جنگ سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے، خواہ اُن کا دشمن افرادی قوت اور جنگی ہتھیاروں میں اُن سے کتنا ہی فائق کیوں نہ ہو۔ البتہ اُن کی تعداد بارہ ہزار سے کم ہو اور اُن کا دشمن برتر ہتھیار رکھتا ہو تو وہ جنگ سے پیچھے ہٹ سکتے ہیں، چاہے اُن کی افرادی قوت دشمن سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر یہ روایت نہ ہوتی یا فقہا اِس سے ایسے استدلال نہ کرتے، جیسے اُنھوں نے کیا تو یقیناً جو معقولیت اُنھوں نے بارہ ہزار سے کم لشکر کے معاملے میں دکھائی، وہ بارہ ہزار کے لشکر کے لیے بھی دکھا پاتے۔

فقہا نے یہ نتیجہ اِس علم کے باوجود نکالا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بھی مسلمانوں کا بارہ ہزار کا لشکر غزوۂ حنین کے موقع پر ایک بار شکست سے دوچار ہو گیا تھا۔ البتہ اُنھوں نے دوبارہ ہمت مجتمع کر کے شکست کو فتح میں تبدیل کر لیا تھا۔ چنانچہ واقعہ بھی سامنے تھا، جس کے مطابق بارہ ہزار کا لشکر بھی ہزیمت کا شکار ہو سکتا ہے، مگر حدیث میں وارد الفاظ واقعہ پر غالب آ گئے اور ایک غلط استدلال قائم کر لیا گیا۔

فقہا اِس روایت میں صرف ایک عقلی قید کا اضافہ کرتے ہیں کہ غلبے کی یہ بشارت اِس سے مشروط ہے کہ مسلمانوں کا کلمہ متحد ہو، یعنی اُن میں باہم کوئی اختلاف نہ ہو۔ یہ اضافہ بھی وہ اِس لیے کرتے ہیں کہ اِسی روایت کے بعض دیگر متون میں، جن کی سند بھی قابل احتجاج نہیں، یہ بات مذکور ہوئی ہے۔ اگر یہ عقلی قید یہاں لگائی جا سکتی ہے تو دیگر عقلی قرائن سے مزید قیدیں بھی اِس میں مضمر سمجھی جا سکتی تھیں، جن کا ذکر پیش تر کیا گیا۔

فقہا کے استدلال کے منہاج میں یہ اِسقام ہیں۔ اس میں پہلے ایک روایت کو دین میں مستقل حکم کا ایک ماخذ باور کیا جاتا ہے، اور پھر اُسے اُس کے سیاق و سباق سے کاٹ کر ایک مستقل حکم بر آمد کر لیا جاتا ہے اور پھر قرآن کے حکم میں نسخ کر دیا جاتا ہے۔ وہ یوں کہ قرآن مجید دشمنوں سے افرادی طاقت کے تناسب کی رعایت رکھتے ہوئے مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ دشمنوں کی تعداد اُن سے دس گنا زیادہ بھی ہو تو وہ اُن سے جنگ کریں۔ مسلمان اگر استقامت دکھائیں گے تو غالب رہیں گے۔ پھر اِس تناسب کو تبدیل کر کے ایک اور دو کی نسبت مقرر کرتا ہے کہ اُن میں کچھ کمزوری در آئی ہے (الانفال ۸: ۶۶)۔ مگر فقہا تناسب کی اِس رعایت کو اُس

صورت میں کالعدم قرار دیتے ہیں جب مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار ہو۔

اِس روایت کی بنا پر قرآن کے حکم میں یہ نسخ فقہا کے اپنے اصول فقہ کی رو سے بھی درست نہیں۔ احناف قرآن مجید میں نسخ کے لیے روایت کا کم از کم مشہور ہونا لازم قرار دیتے ہیں، مگر یہاں ایک مرسل روایت سے قرآن کے حکم میں نسخ کر دیا گیا ہے۔

قانون کے ایک پروفیسر صاحب فقہا کے اِس نتیجہ کی بنیاد پر آج کے مسلمانوں کو بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ جنگی ٹیکنالوجی کے فرق کی وجہ سے وہ دشمنوں کے مقابلے سے صرف اُسی صورت میں دست بردار ہو سکتے ہیں، جب اُن کی تعداد 'بارہ ہزار' سے کم ہو، لیکن اُن کی تعداد بارہ ہزار یا اِس سے زائد ہو تو پھر اُنھیں ہر صورت مقابلہ کرنا ہو گا، کیونکہ بارہ ہزار کا لشکر مغلوب نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر صاحب امام ابو بکر جصاص سے نقل کرتے ہیں:

و الذي روي عن النبي صلى الله عليه وسلم في اثنى عشر ألفًا، فهو أصل في هذا الباب؛ و إن كثر عدد المشركين، فغير جائز لهم أن يفروا منهم، و إن كانوا أضعافهم، لقوله صلى الله عليه وسلم «إذا اجتمعت كلمتهم»، وقد أوجب عليهم بذلك جمع كلمتهم.

"اور بارہ ہزار کے متعلق جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا تو وہ اس باب میں اصل کی حیثیت رکھتا ہے، خواہ مشرکین کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو، مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہو گا کہ وہ ان کے مقابلے سے بھاگ جائیں، چاہے وہ ان سے کئی گنا زیادہ ہوں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ان کا کلمہ ایک ہو۔ اور اس قول کے ذریعے سے ان پر واجب کیا کہ وہ کلمہ ایک کریں۔"

اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"پس ایسی صورت میں (یعنی جب ان کی تعداد بارہ ہزار ہو) مسلمان یہ عذر نہیں پیش کر سکتے کہ ان کا آپس میں اتحاد نہیں ہے اور اس لیے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کے برعکس ایسی صورت میں ان پر شرعاً واجب ہو گا کہ وہ متحد ہو کر دشمن کے خلاف لڑیں اور یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے گا اور انھیں دشمن پر غالب کرے گا۔[1]"

---

[1] قدسیوں کے لیے قدرت اور استطاعت کی شروط، از ڈاکٹر مشتاق https://daleel.pk/36962/۔

ایک طرف جنگی طاقت اور ٹیکنالوجی کے فرق کی ناقابل تردید حقیقت اور دوسری طرف بارہ ہزار کی تعداد سے فقہا کے استدلال کی رعایت، اِس نازک مقام سے پروفیسر صاحب یوں گزرے ہیں:

”...یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عددی نسبت کا لحاظ تو اس زمانے میں رکھا جاسکتا تھا جب افرادی قوت ہی میدان جنگ میں اہم کردار ادا کرتی تھی۔ موجودہ دور میں جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے فرد کی اہمیت کو نسبتاً گم کر دیا ہے کیا زیادہ اہم سوال یہ نہیں ہو گا کہ ٹیکنالوجی کے لحاظ سے دشمن کہاں کھڑا ہے؟ اگر مسلمان فوج کی تعداد دس ہزار ہے، مگر اس کے پاس روایتی بندوق ہیں اور دشمن کی تعداد سو ہے، مگر اس کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں تو مقدرت کا اندازہ تعداد سے لگایا جائے گا یا اسلحے کی نوعیت سے؟...“

امام سرخسی نے اس موضوع پر جو کچھ کہا ہے وہ یقیناً قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

إن كان عدد المسلمين مثل نصف عدد المشركين لا يحل لهم أن يفروا ... وكان الحكم فى الابتداء أنهم إذا كانوا مثل عشر المشركين لا يحل لهم أن يفروا ... وهذا إذا كان بهم قوة القتال بأن كانت معهم الأسلحة؛ فأما من لا سلاح له، فلا بأس بأن يفر ممن معه سلاح؛ و كذلك لا بأس بأن يفر ممن يرمي إذا لم يكن معه آلة الرمي. ألا ترى أن له أن يفر من باب الحصن، ومن الموضع الذى يرمى فيه بالمنجنيق، لعجزه عن المقام فى ذلك الموضع. وعلى هذا، لا بأس بأن يفر الواحد من الثلاثة، إلا أن يكون المسلمون اثني عشر ألفًا كلمتهم واحدة، فحينئذٍ لا يجوز لهم أن يفروا من العدو و ان

”(اگر مسلمانوں کی تعداد مشرکین کے نصف کے برابر ہو تو ان کے لیے جائز نہیں کہ وہ فرار اختیار کریں، اور ابتدا میں حکم یہ تھا کہ اگر ان کی تعداد مشرکین کے دسویں حصے کے برابر ہو تو ان کے لیے جائز نہیں تھا کہ وہ فرار اختیار کرتے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب ان میں جنگ کی قوت ہو، یعنی ان کے پاس اسلحہ ہو۔ پس جس کے پاس اسلحہ نہ ہو اس کے لیے اسلحہ رکھنے والے کے مقابلے سے فرار اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسی طرح اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ اگر اس کے پاس رمی کا آلہ نہ ہو تو وہ رمی کرنے والے سے فرار اختیار کرلے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس کے لیے جائز ہے کہ قلعے کے دروازے سے اور اس جگہ سے جہاں منجنیق سے گولے پھینکے جا رہے ہوں فرار ہو جائے، کیونکہ وہ اس جگہ ٹھیرنے سے عاجز ہوتا ہے؟ ان اصولوں کی بنا پر تنہا شخص کے لیے تین افراد کے

كثروا، لأن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لن يغلب اثنا عشر ألفا عن قلة. ومن كان غالباً، فليس له أن يفر.

مقابلے سے فرار اختیار کرنا جائز ہے، سوائے اس حالت کے جب مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار ہو اور ان کا کلمہ ایک ہو۔ پس اس حالت میں ان کے لیے دشمن سے فرار اختیار کرنا جائز نہیں خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بارہ ہزار کا گروہ تعداد میں کمی کے سبب سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ اور جو غالب ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ فرار اختیار کر لے۔)[۲]''

اِس نتیجۂ فہم پر عملاً کبھی کسی لشکر، کسی حکومت نے عمل نہیں کیا۔ ایسا کرتے تو بارہ ہزار تک ہی فوج رکھا کرتے۔ بڑی فوجیں رکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، مگر پروفیسر صاحب کو اصرار ہے کہ اہل فلسطین اس پر عمل کریں۔ وہ اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمن سے جنگ میں پیچھے نہیں ہٹ سکتے، کیونکہ بارہ ہزار جنگجو تو اُنھیں میسر ہی ہیں۔ تاہم، وہ اِس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ بارہ ہزار سے زائد 'قدسیوں' کا لشکر ہر بار مغلوب کیوں ہو جاتا ہے؟ حدیث فقط یہ تو نہیں کہتی کہ بارہ ہزار کا لشکر جنگ سے دست بردار نہیں ہو سکتا، بلکہ اُنھیں مغلوب نہ ہونے کی بشارت سناتی ہے۔ اگر قدسیوں کا ایمان کم زور ہے یا اُن کا کلمہ متحد نہیں تو اِس صورت میں بھی اُنھیں جنگ روک کر پہلے اپنے ایمان کی مضبوطی اور کلمہ کے اتحاد پر کام کرنا چاہیے۔

کم زور مظلومین کے لیے لائحۂ عمل وہ نہیں جو فقہا کے ایک غلط استدلال کی بنیاد پر علم و عقل سے دست بردار ہو کر جنگ زدہ فلسطین اور دیگر کم زور مسلمانوں کے لیے تجویز کیا جا رہا ہے، بلکہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں مکہ اور گردونواح کے مظلوم اور بے بس مسلمانوں کے لیے خود وضع کیا تھا۔ ارشاد ہوا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ

''(ایمان والو)، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے جو فریاد کر رہے ہیں کہ پروردگار، ہمیں اِس بستی سے نکال کہ جس کے لوگ ظالم ہیں

۲۔ قدسیوں کے لیے قدرت اور استطاعت کی شروط، از ڈاکٹر مشتاق https://daleel.pk/36962/۔

لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا.(۴:۷۵)

اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ہم درد پیدا کر دے اور اپنے پاس سے حامی اور مددگار پیدا کر دے۔“

کم زور مظلوموں کی مدد کرنا مسلمانوں کی ریاستوں کا فرض ہے۔ وہ اگر اپنا فرض نبھانے کی جرأت یا طاقت نہیں رکھتیں تو اب یہ کم زور مظلوموں کا کام نہیں اور نہ یہ اُن کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے حقوق کے لیے خود ہتھیار اٹھا لیں۔ اِس سے اُن کے مصائب میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ مظلوم کا ہتھیار دعا ہے، اسے تلوار اٹھانے کا مشورہ یا حکم خدا نے نہیں دیا۔

موجودہ صورت حال میں اہل فلسطین کے پاس تین ہی راستے ہیں:

۱۔ اگر اُنھیں جنگ سے احتراز کی صورت میں جان، مال اور آبرو کا تحفظ حاصل ہے تو اُنھیں جو میسر ہے، اُس پر قناعت کریں اور اپنے حقوق کی جدوجہد کو پرامن طریقوں سے جاری رکھیں اور اپنی تعمیر پر توجہ دیں۔

۲۔ اگر اُنھیں پرامن رہنے کے باوجود یہ تحفظ حاصل نہیں تو وہ ہجرت کر جائیں۔

۳۔ اگر ہجرت کرنے پر پابندی ہے یا ہم سایہ ریاستیں اُنھیں پناہ دینے پر تیار نہیں تو اب اُنھیں صبر سے عدم تشدد کی پالیسی پر عمل پیرا رہنا ہے، یہاں تک کہ کوئی بیرونی طاقت اُن کی مدد کو آجائے۔

پرامن رہنے کے باوجود اُنھیں اگر انخلا پر مجبور کیا جاتا ہے اور عالمی برادری بھی ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑتی تو جان اور زمین کے درمیان انتخاب انھیں اپنی جان کا کرنا چاہیے، کیونکہ لڑنے کی صورت میں وہ اپنی زندگی اور زمین، دونوں گنوا دیں گے۔ انخلا کر جانے کی صورت میں جان تو بچ جائے گی اور جدوجہد کے امکانات پیدا ہوتے رہیں گے۔ مجبوری کے ایسے عالم میں انفرادی سطح پر عقل یہی راستہ سجھاتی ہے۔ اجتماعی معاملے میں بھی اِسی کو اختیار کرنا چاہیے۔

تاہم، اگر پرامن رہنے کے باوجود اُن کی نسل کشی کی جاتی ہے تو اب یہ اضطراری حالت ہے۔ اِس صورت میں اپنے دفاع میں وہ چاہیں تو لڑتے ہوئے موت کو گلے لگا لیں، لیکن یہ صورت حال، درحقیقت اہل فلسطین کو درپیش نہیں۔ اُنھیں حماس کی جنگی کارروائیوں کے بعد تباہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حماس، فقط دفاعی جنگ نہیں لڑتی، بلکہ آگے بڑھ کر اقدام کرتی ہے۔ اور یہ وہ اُس وقت بھی کرتی ہے جب جنگ نہیں ہو رہی ہوتی۔ یہ دفاع نہیں، دعوت مبارزت ہے، جسے دے کر وہ زیر زمین چھپ جاتی اور عام لوگوں کو کھلے آسمان تلے بے رحم میزائلوں اور بموں کا نشانہ بننے کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ کم زور مظلوم کے لیے جوابی طور پر لڑنا دینی فریضہ نہیں، بلکہ مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے حکم یہ ہے کہ جنگ سے پہلے وہ دشمن کی طاقت سے اپنی طاقت کی نسبت کا لحاظ رکھ کر مقاومت کا فیصلہ کرے۔

سورۂ انفال کی آیت ۶۵ میں صحابۂ کرام کی جماعت کے لیے اُن کے دشمنوں سے جنگ کے لیے یہ نسبت ایک اور دس رکھی گئی تھی۔ کچھ مدت بعد اِسے بھی تبدیل کر کے ایک اور دو کی نسبت قائم کی گئی اور وجہ یہ بتائی گئی کہ اُن میں کچھ کم زوری در آئی تھی۔ یہ کم زوری نئے مسلمان ہونے والوں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ. اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. (الانفال ۸: ۶۵-۶۶)

”اے پیغمبر، اِن مومنوں کو (اُس) جنگ پر ابھارو (جس کا حکم پیچھے دیا گیا ہے)۔ اگر تمھارے لوگوں میں بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے سو ہوں گے تو ہزار منکروں پر بھاری رہیں گے، اِس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو بصیرت نہیں رکھتے۔ اِس وقت، البتہ اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، اِس لیے کہ اُس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کم زوری ہے۔ سو تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے ہزار ایسے ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری رہیں گے۔ اور اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو (اُس کی راہ میں) ثابت قدم رہیں۔“

یہ وہ جماعت تھی جسے خدا کی نصرت حاصل تھی۔ فرشتے اُن کی مدد کو قطار اندر قطار اترنے کے منتظر رہتے تھے۔ اُن کے لیے بھی اُن کے دشمنوں کے مقابلے میں اُن کی کم زوری کی رعایت رکھتے ہوئے طاقت کی نسبت میں تبدیلی کر دی گئی تھی۔ اِس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ طاقت کی نسبت میں یہ رعایت بعد والوں کو بدرجۂ اولیٰ ملحوظ رکھنی چاہیے۔ اِن کے ہاں طاقت کی نسبت اب جنگی ٹیکنالوجی کے فرق سے طے ہو گی۔ غرض یہ کہ کامیابی

کے امکان کا اندازہ کر کے جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

نتائج سے بے پروا ہو کر لڑتے چلے جانا، یہ انیسویں اور بیسویں صدی میں نظریۂ قومیت کے متاثرین کا ایجاد کردہ جنون ہے، جو زمین اور اقتدار کے حصول کو انسانی جان پر فوقیت دیتا ہے، جو غیر قومی اور غیر مقامی انسانوں کی حکومت کو حرام اور ہم قومی اور مقامی حکومت ہی کو جائز تصور کرتا ہے اور اِن چیزوں کے لیے انسانی جانوں کے بے دریغ ضیاع کو قربانی اور شہادت کا نام دیتا ہے۔ نظریۂ قومیت کا اپنا دین اور اپنی شریعت ہے۔

اِس کے برعکس، خدا کی نظر میں سب سے قیمتی چیز خود انسان ہے، جسے یہ بھی اجازت ہے کہ وہ کلمۂ کفر کہہ کر اپنی جان بچا لے۔ اُس پر مکہ کی مقدس زمین بھی اگر تنگ ہو جائے تو وہ وہاں سے بھی ہجرت کر جائے، مگر بے فائدہ لڑ مر کر 'امر' ہونے کی ضرورت نہیں۔ اندھا دھند شہادتیں دین کا تقاضا نہیں۔

ساری طاقتیں رکھتے ہوئے بھی خدا نے جو رعایتیں جماعت صحابہ کے لیے ملحوظ رکھیں، اُنھیں آج کے مسلمان، اُن کے جذباتی دانش ور اور علما غیروں سے سیکھی طرز مقاومت کی بنیاد پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اِس کا نتیجہ مسلسل ہزیمت کی صورت میں سامنے ہے۔ یہ ایسے ہی چلتا رہے گا، جب تک وہ ہوش کے ناخن لینے پر تیار نہیں ہو جاتے، کیونکہ خدا اپنے طریقے بدلنے والا نہیں۔

محمد ذکوان ندوی

’کلمۂ اسلام‘ کی عظمت

ایک مومن کے لیے اِس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں کہ وہ صرف اللہ کا بندہ اور رسول کا امتی ہے، نہ کہ دوسرے کسی اور شخص یا فکر و نظریے کا اسیر۔ اِس کلمۂ اسلام کا یہ اولین تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ کو اپنا معبود برحق و وحدہٗ لاشریک خدا تسلیم کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پورے دل و جان سے اپنا مطاع مطلق قرار دے۔ چنانچہ اللہ کے سوا نہ کوئی اُس کا معبود ہے، اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی اور زندہ یا غیر زندہ ہستی کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ رسول جیسے مطاع مطلق قائد اور رہنما و امام کا درجہ پا سکے۔

خدا اور رسول، دونوں میں سے کسی ایک کی اِس استثنائی حیثیت کے متعلق کوتاہی اور بے شعوری عملاً ’کلمۂ اسلام‘ کی تصغیر اور اُس کے ساتھ دغا و بے وفائی کے ہم معنی ہوگا۔ اسلام کا یہ کلمہ سادہ معنوں میں، محض ایک کلمہ نہیں، بلکہ وہ ایک ایسا انقلابی نظریۂ حیات ہے جو ایک سچے مومن کو تمام معبودان باطل کی بندگی اور تمام بتان رشتہ و پیوند کی قید سے آزادی عطا کرتا ہے۔

گویا یہی ’کلمۂ اسلام‘ وہ ”ایک سجدہ“ ہے جو آدمی کو تمام ”سجدوں“ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ایک خدائے واحد پر ایمان دوسرے تمام ’خداؤں‘ سے بلند اور رسول برحق کی رسالت کا اقرار دوسرے تمام مفروضہ رہنماؤں کی غیر مشروط رہنمائی سے آزاد کر دیتا ہے۔ یہ ایمان تمام مربیین واساتذہ کو انتہائی محترم بناتا ہے، مگر اِس استفادہ و احترام سے ہٹ کر، رسول برحق کے سوا کسی اور نظریہ و انسان کو غیر مشروط اطاعت کا مقام دینے کی نفسیات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیتا ہے، جس میں آدمی کی اپنی شخصیت اور اُس کا پورا وجود ہمیشہ کے لیے ایک کورانہ تقلید محض کا اسیر بن کر رہ جائے، یہاں تک کہ وہ جب بھی دیکھے، تو اُسی کے ذہن سے، اور سوچے تو ہمیشہ اُسی

کے متعین کردہ خطوط پر سوچے۔

اِس موقع پر ترجمان حقیقت ڈاکٹر اقبال کا ایک قیمتی شعر راقم کے ذہن میں گونج رہا ہے:

ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہاں ایک لطیف ترمیم کے ساتھ یہ شعر پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

یہ ایک 'کلمہ' جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار 'کلموں' سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہی 'کلمۂ اسلام' وہ اصل ربانی آئیڈیالوجی اور راہ فکر و عمل ہے جسے پوری طرح ماننے اور اختیار کرنے کا مطالبہ خدا کا دین ایک سچے مومن سے کرتا ہے۔ یہی 'کلمۂ اسلام' وہ 'شجرۂ طیبہ' (ابراہیم ۱۴: ۲۴) ہے جو ہر موقع پر اہل ایمان کے لیے سایۂ رحمت بن کر ایک خزاں ناآشنا درخت کے مانند لہلہاتا رہتا ہے:

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الہ الا اللہ!

اِس 'کلمۂ اسلام' کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کے سوا، اِس کائنات میں کوئی اور الہ و معبود نہیں، اور رسول برحق و پیغمبر آخر الزماں (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کسی قائد اور رہنما کو یہ مقام حاصل نہیں کہ وہ ایک ایسے مطاع مطلق کا درجہ پا سکے جو مستند وحی ربانی پر مبنی ایک خالی از خطا (infallible) ماخذ کی حیثیت رکھتا ہو۔ اِس اعتبار سے، یہ 'کلمۂ اسلام' آدمی کے لیے سچے استغنا اور کامل حریت کے ایک ابدی اور ربانی پروانے کی حیثیت رکھتا ہے۔

[۱۰ رجولائی ۲۰۲۴ء]

محمد صدیق بخاری

تعصب اور تنگ نظری

وہ ایک بڑے مفتی صاحب کا گھر تھا اور انگریزی کا استاد ان کے بچوں کو انگریزی پڑھا رہا تھا۔ دوران تعلیم میں 'ابلیس' کا ذکر آیا تو مفتی صاحب کی بیٹی، جو کہ آٹھویں جماعت کی طالبہ ہے، نے پوچھا: سر، ابلیس کسے کہتے ہیں؟ استاد نے کہا: بیٹا، شیطان کو۔ بچی ایک لمحے کو چونکی۔ استاد نے پوچھا کہ بیٹا، کیا ہوا؟ بچی نے کہا: لیکن... لیکن... سر...، وہ... میرے ابو تو کہتے ہیں کہ شیطان، غامدی کو کہتے ہیں۔ استاد نے بات کا رخ بدل دیا، لیکن کتنے ہی دن وہ یہ سوچتا رہا کہ دنیا کی مختلف جامعات سے فارغ التحصیل ایک سند یافتہ عالم اور مفتی کل قیامت کو اللہ کے حضور اپنے الفاظ کو کیسے ثابت کرے گا۔ شاید لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے منہ سے نکلے الفاظ خلا میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اے کاش، ایسا ہوتا...! لیکن ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ 'ما یلفظ من قول إلا لدیه رقیب عتید'۔

وہ سادہ سا نیک دل نوجوان بچپن سے ہی نماز روزے کا پابند تھا۔ ایف اے کے بعد اس نے سوچا کہ عالم دین بنا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک مخصوص مسلک کے مدرسے میں داخلہ لے لیا۔ اس داخلے سے پہلے بھی وہ نمازی تھا اور اس کا چہرہ بھی ڈاڑھی آشنا تھا، لیکن اس داخلے کے بعد اس میں یہ تبدیلی آئی کہ وہ نماز کے لیے خاص مسلک کی مسجد ڈھونڈنے لگا اور پھر کچھ دیر بعد یہ تبدیلی بھی آئی کہ وہ امام مسجد کی ڈاڑھی کا سائز بھی چیک کرنے لگا اور پھر کچھ عرصہ بعد وہ ٹوپی، پگڑی کے رنگ کا دھیان بھی کرنے لگا۔ جوں جوں اس کے سال گزرتے گئے، وہ ایک مخصوص رنگ میں رنگنے لگا اور آج، جب کہ وہ اس مدرسے کے آخری سال میں پڑھ رہا ہے، اسے اپنے مسلک سے وابستہ لوگوں کے علاوہ باقی سب کے بارے میں یقین ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے کافر ہیں، جب کہ مجھے یقین ہے کہ وہ جب مکمل فارغ التحصیل ہو جائے گا تو آج کے یہ چھوٹے چھوٹے کافر اس کے لیے بڑے بڑے

کافر بن چکے ہوں گے۔

مدارس میں پڑھنے والوں کے ہاں عمومی طور پر ایسی تبدیلی کیوں آ جاتی ہے، اس کی وجہ جاننے کی سنجیدہ کوشش قومی سطح پر کبھی نہیں کی گئی اور نہ ہی مستقبل میں ایسی کوئی امید نظر آتی ہے۔ پہلے میرے جیسے لوگ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتے تھے کہ یہ تعصب اور تنگ نظری نچلی سطح پر پائی جاتی ہے، مگر مفتی صاحب اور اس جیسی چند اور مثالیں دیکھ کر اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ خرابی اصل میں کہیں اور ہے اور جب تک رسی کے اس سرے تک نہ پہنچا جائے گا، یہ ڈور سلجھنے والی نہیں۔

ہمارے خیال میں خرابی اصل میں، تصور دین میں پوشیدہ ہے۔ دین کیا ہوتا ہے، دین اور فقہ میں کیا فرق ہے، دین کا ماخذ کیا ہے اور دین کی وسعت کیا ہے، ہر انسان کی زندگی میں دین کا کیا رول ہے اور یہ کہ کلچر اور دین میں کیا فرق ہے؟ ان سب باتوں کا جواب ہر ہر طالب علم کو روز اول سے ہی مل جانا چاہیے۔ یہ جوابات طالب علم کو جس شکل میں ملیں گے، دین کی ویسی ہی تصویر اس کے ذہن پر مرتسم ہوتی چلی جائے گی اور پوری زندگی وہ اسی کے گرد گھومتا رہے گا۔ ہمارے ہاں ان سوالات کو ایڈریس ہی نہیں کیا جاتا اور طالب علم عمر بھر یہی سمجھتا رہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا عرب کلچر یا قرون اولیٰ میں لکھی گئیں فقہی کتب میں درج آرا یا اس کے اساتذہ کے ارشادات ہی اصل دین ہیں۔

دین کا ماخذ صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ انھی سے قرآن ملا ہے اور انھی سے سنت۔ لیکن ہمارے ہاں المیہ یہ ہو گیا ہے کہ دین کا ماخذ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہو کر اماموں تک محدود ہوا، اور اب روبہ زوال ہوتے ہوتے حالت یہاں تک آ گئی ہے کہ دین کا ماخذ ہر طالب علم کا اپنا مسلک، اپنا مدرسہ یا اپنا استاد رہ گیا ہے۔ جس طرح دین کا ماخذ سکڑتے سکڑتے ایک مدرسے تک محدود ہو گیا ہے، اسی طرح وہ دین جو پوری انسانیت کا دین تھا، سمٹتے سمٹتے ایک مسلک یا جماعت کا دین بن کر رہ گیا ہے۔

دین اور دین داروں کی وسعت قلبی کا کیا عالم تھا، اس کے لیے ضروری ہے کہ طلبا کو صحابہ کی زندگی اور ان کے خیالات سے آشنا کرایا جائے۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مصر کے دار الخلافے کا محاصرہ کیا ہوا تھا، آپ کو مخبروں نے اطلاع دی کہ شہر کا شہر مسلمان ہونے کو بے تاب ہے، مگر انھیں یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ ایک ترقی یافتہ قوم صحرا کے بدوؤں کا کلچر کیسے اختیار کرے گی۔ یہ سن کر آپ نے شہر کے تمام رؤسا کی دعوت کا انتظام کیا۔ خود بھی مصری لباس پہنا،

باورچیوں کو بھی مصری باورچیوں کا سا رسمی لباس پہنایا اور کھانے بھی خالص مصری انداز کے پکائے۔ دستر خوان تک کی ہیئت میں مصری انداز اختیار کیا۔ مصری رؤسا جب دعوت میں آئے تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انھیں لگا گویا وہ کسی مصری تقریب میں ہی شریک ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد حضرت خالد بن ولید نے چھوٹا سا خطاب فرمایا، جس میں ارشاد فرمایا: ''مصر والو، جب ہم تم میں آئیں گے تو تمھارا لباس اور کلچر اختیار کریں گے۔ مصر میں ہم یوں ہوں گے جیسا کہ تم نے ہمیں دیکھا ہے، صحرا میں ہم یوں ہوں گے جیسا کہ تم نے ہمارے بارے میں سنا ہے اور میدان جنگ میں ہم یوں ہوں گے جیسا کہ تم نے ہمیں آزمایا ہے۔ فیصلہ تمھارا اپنا ہے''۔ اگلے دن شہر نے حضرت خالد بن ولید کے لیے دروازے کھول دیے۔

صحابہ کے تصور دین کی وضاحت کے ساتھ ساتھ دین کے ہر طالب علم کو یہ بات از بر کرانے کی اشد ضرورت ہے کہ یہ دین، ایک عالم گیر دین ہے، سب زمانوں کے لیے ہے اور سب انسانوں کے لیے ہے، اس لیے کسی امر کو دین کہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس معیار پر پورا اترے، یعنی وہ امر ایسا ہو کہ جسے سب انسان پورا کر سکیں، ہر زمانے میں کر سکیں اور ہر علاقے میں کر سکیں۔ اگر دین کے نام پر کوئی ایسی ہدایت دی جا رہی ہے کہ جسے کسی خاص علاقے کے لوگ کسی خاص موسم یا حالات میں ادا کر سکتے ہیں تو وہ رسم، رواج، کلچر یا معاشرتی آداب جیسی کوئی چیز تو ہو سکتی ہے، دین نہیں۔ یہی وہ اصل بات ہے جسے ذہن نشین نہ کرانے کی وجہ سے وہ تعصب اور تنگ نظری جنم لے رہی ہے کہ جس کی مثال مفتی صاحب اور وہ سادہ سا نیک دل نوجوان ہے۔

شاہد رضا

غیر مسلم: چند جدید تفہیمات

(۲)

[جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو سے اخذ و استفادہ پر
مبنی زیر طبع کتاب ''اسلام اور دیگر مذاہب'' سے انتخاب]

غیر مسلم بچے اور آخرت

سوال: غیر مسلم خاندان میں پیدا ہونے والے بچے کے ساتھ آخرت میں کیا معاملہ ہو گا؟

جواب: قرآن مجید نے اس سوال کا جواب بڑی تفصیل کے ساتھ دے دیا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ انسانوں کی تین قسمیں ہیں:

ایک وہ لوگ جن تک کسی پیغمبر کی دعوت نہیں پہنچی۔ بلکہ قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ نہ صرف یہ کہ ان لوگوں تک دعوت نہیں پہنچی، بلکہ ان کے آبا و اجداد کو بھی کسی پیغمبر نے انذار نہیں کیا:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ. (یٰسٓ ۳۶:۶)

''(یہ قرآن) اِس لیے اتارا گیا ہے کہ تم اُن لوگوں کو خبر دار کرو جن کے اگلوں کو خبر دار نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

چنانچہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ جو اُن کے دل اور شخصیت میں، میں نے اُن کی پیدایش کے وقت دین الہام کر دیا تھا، یعنی اپنا تصور الہام کر دیا تھا، اس کے لیے عہد الست کا حوالہ سورۂ اعراف میں ان الفاظ میں دیا ہے:

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُھُوۡرِھِمۡ ذُرِّیَّتَھُمۡ وَاَشۡھَدَھُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِھِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَھِدۡنَا ۚۛ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ ھٰذَا غٰفِلِیۡنَ. اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَکُنَّا ذُرِّیَّۃً مِّنۡۢ بَعۡدِھِمۡ ۚ اَفَتُھۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ. وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ وَلَعَلَّھُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ. (۷:۱۷۲-۱۷۴)

”(اے پیغمبر)، اِنھیں وہ وقت بھی یاد دلاؤ، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ ٹھیرایا تھا۔ (اُس نے پوچھا تھا): کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہاں، (آپ ہی ہمارے رب ہیں)، ہم اِس کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اِس لیے کیا کہ قیامت کے دن تم کہیں یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اِس بات سے بے خبر ہی رہے یا اپنا یہ عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر کیا آپ اِن غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟ ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو اور اِس لیے کہ وہ رجوع کریں۔“

اور یہ بتادیا ہے کہ اخلاقی شعور الہام کر دیا تھا کہ اچھائی اور برائی کیا ہے:

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىھَا. فَاَلۡھَمَھَا فُجُوۡرَھَا وَتَقۡوٰىھَا. (الشمس ۹۱: ۷-۸)

”اور نفس اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی بدی اور نیکی اُسے سجھا دی۔“

لہٰذا فرمایا ہے کہ میں صرف اس پر سوال کروں گا۔ چونکہ ان تک کسی پیغمبر کی دعوت ہی نہیں پہنچی تو سوال بھی اسی دائرے میں ہو گا۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن تک پیغمبروں کی دعوت پہنچ گئی، جیسے مسیحی یا یہود۔ چنانچہ سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں ایک ایک گروہ کا باقاعدہ نام لے کر، خواہ وہ یہودی ہوں، نصرانی ہوں یا صابئی ہوں، یہ اعلان کر دیا کہ ان سے، البتہ جو اُن کو تعلیم پہنچی ہے، اس میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل ہے، اس کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا۔

تیسرے وہ لوگ ہیں جن تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچ گئی اور انھوں نے ضد، ہٹ دھرمی

یا عناد کی بنیا پر انکار نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کا عذر ہو گا، لیکن ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ دعوت یا پیغام آپ تک پہنچا؟

انسان سے اللہ تعالیٰ کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ اگر مسلمان یا یہودی یا نصرانی پیدا ہو گیا ہے تو اس کو اندھا اور بہرا بن کر اپنے آبا کی پیروی کرنی چاہیے، بلکہ اس سے یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ صحیح بات کو جانے۔ ہم صرف عمل کے امتحان میں نہیں ڈالے گئے، بلکہ علم کے امتحان میں بھی ڈالے گئے ہیں، اس لیے مسلمانوں سے بھی پوچھا جائے گا کہ تم نے جو دین اپنے ماں باپ سے سیکھا تھا، اس کے بارے میں سوال کیا تھا؟ تمھارے دل میں کوئی کھٹک پیدا ہوتی تو اس کی تحقیق کرنے کی کوشش کی تھی؟ کبھی کسی دوسرے صاحب علم نے اس کی غلطی بتانا چاہی تو اس کی بات توجہ سے سنی تھی؟ یہ ہم سے بھی پوچھا جائے گا اور ان سے بھی، اس لیے ہم سارے ایک ہی جگہ پر کھڑے ہیں۔ جس شخص کے پاس جتنا علم پہنچا ہے، اس لحاظ سے اس سے پوچھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں پر ادنیٰ درجے میں بھی ظلم نہیں کرے گا۔[1]

غیر مسلم کو مسجد میں عبادت کی اجازت

سوال: کیا غیر مسلموں کو مساجد میں عبادت کی اجازت دی جاسکتی ہے؟

جواب: کسی غیر مسلم کو شرک کے لیے تو مسجد نہیں دی جاسکتی، کیونکہ مسجد توحید اور اللہ کی عبادت کی جگہ ہے۔ ایک مسیحی یا یہودی اللہ کی عبادت اپنے طریقے پر کرنا چاہتا ہے تو وہ مسجد میں کر سکتا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا، یعنی اللہ کی عبادت اپنے طریقے پر۔ ہم مسلمان اللہ کی عبادت کرتے ہیں؛ جس طرح ہمارا نماز پڑھنے کا ایک طریقہ ہے، اسی طرح ان کا بھی ایک طریقہ ہے۔ چنانچہ اگر غیر مسلم مسجد میں آکر صلیب گاڑ دیں یا سیدہ مریم علیہا السلام کی تصویر رکھ دیں تو اس کے لیے ان سے معذرت کی جائے گی اور انھیں مسجد نہیں دی جائے گی، کیونکہ ہمارے ہاں شرک کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن ہر شخص کو اپنے طریقے کے مطابق اللہ کی عبادت اور اس کی بندگی کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ عبادت مسجد میں

۱- https://ghamidi.com/videos/on-the-day-of-judgement-what-will-happen-to-a-child-born-in-a-nonmuslim-family-2215

کرنا چاہیں تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں اس کی اجازت دی ہے (الطبقات الکبریٰ ۱/ ۳۵۷)۔[۲]

حرمین میں غیر مسلموں کو داخلے کی اجازت

سوال: حرمین میں غیر مسلموں کو داخلے کی اجازت کیوں نہیں؟

جواب: یہ نقطۂ نظر ایک غلط تاویل (interpretation) کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ یہ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اس توحید کے مرکز کی طرف جائے اور جا کر دیکھے۔ وہ تو ہماری دعوت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ جب وہاں پر ایک غیر مسلم جائے گا تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس پر کیا اثرات ہوں گے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں غیر مسلم حرمین ہی میں آ کر ملتے تھے۔ چنانچہ یہ بات بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے کہ غیر مسلم حرمین میں داخل نہیں ہو سکتے۔

البتہ مشرکین عرب پر چونکہ اللہ کے عذاب کا فیصلہ ہوا تھا تو قرآن مجید نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اب اس سال کے بعد یہ قریب نہیں آ سکتے۔ اس کو لوگوں نے عام کر لیا اور اس کے نتیجے میں ان کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ پابندی صرف ایک ہی ہے کہ جزیرہ نماے عرب میں کوئی غیر مسلم مستقل رہایش اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ زیارت کے لیے جا سکتے ہیں۔[۳]

غیر مسلم کی اسلامی ریاست میں اپنے مذہب کی تبلیغ

سوال: کیا غیر مسلم اسلامی ریاست میں اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتا ہے؟

۲- https://ghamidi.com/videos/can-nonmuslims-be-allowed-to-worship-in-the-mosque-3099

۳- https://ghamidi.com/videos/why-are-non-muslims-not-permitted-entry-to-makkah-3100

جواب: اسلامی ریاست میں کسی انسان کو اپنے مذہب کی تبلیغ سے نہیں روکا جا سکتا۔ جب وہ اپنا نقطۂ نظر شایستگی کے ساتھ بیان کرے تو قرآن و حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنیاد پر اسے روکا جا سکے۔ اگر غیر مسلمان مسلمانوں کو اپنی بات بتانا چاہتے ہیں تو بتا سکتے ہیں۔ اگر ہم انھیں اپنی بات کہنے کا موقع دیں گے تو ہمیں اپنی بات ان کے سامنے بیان کرنے کا موقع ملے گا۔ قرآن و حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں کہ جس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا ہو۔[۴]

بیت المقدس اور مسلمانوں کا حق

سوال: کیا مسجد اقصیٰ یا بیت المقدس یا ہیکل پر صرف مسلمانوں کا حق ہے؟

جواب: سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ مسجد اقصیٰ اور ہیکل، دونوں الگ الگ مقامات ہیں۔ یہود کہتے ہیں کہ ہیکل کی کچھ بنیادیں اس مسجد کے نیچے آ گئی ہیں۔ تصادم کی بنیاد یہی ہے۔ یہود اس میں ہیکل کی بنیادوں کو تلاش کرنا چاہتے ہیں، جب کہ مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہے کہ شاید ان بنیادوں کو تلاش کرنے کی وجہ سے مسجد ہی منہدم ہو جائے گی۔ اس وقت جس مقام کو مسجد اقصیٰ کہتے یا جہاں آپ جاتے یا نماز پڑھتے ہیں، وہ بعینہٖ ہیکل نہیں ہے۔ بیت المقدس تو اللہ تعالیٰ کی وہ عبادت گاہ تھی جو سیدنا داؤد علیہ السلام نے بنانی شروع کی اور سیدنا سلیمان علیہ السلام نے مکمل کی تھی۔ اس کے بعد یہود پر حملے ہوئے اور یہ تباہ کر دی گئی۔ آخری مرتبہ طیطس رومی نے اس کو تباہ کر دیا اور اسے بالکل زمین بوس کر دیا۔ موجودہ دور میں اس کی ایک دیوار باقی رہ گئی ہے، جسے 'دیوار گریہ' کہا جاتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں فلسطین پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اقوام متحدہ نے اسے برطانیہ کو انتداب (Administration) میں دے دیا۔ اس کے بعد ایک خاص وقت میں فاتحین نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ یہود کو ان کے قومی وطن میں واپس لے جائیں۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ فیصلہ غلط ہوا یا صحیح ہوا، یہ فیصلہ ایک امر واقع کے طور پر ہو گیا۔ اب وہاں پر یہود کی بھی ایک حکومت قائم ہو گئی ہے۔ یہ حکومت جس اصول پر قائم ہوئی اور اقوام متحدہ نے جس طرح اس کی اجازت دی، وہ سب کچھ لکھا ہوا موجود ہے۔

۴- https://ghamidi.com/videos/can-a-nonmuslim-preach-his-religion-in-a-muslim-state-2769

اس سرزمین میں فلسطینی عرب اور مسلمان بھی موجود ہیں۔ اب صرف ایک ہی راستہ تھا کہ اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نکالا جائے جو جنگ وجدال پر مبنی نہ ہو۔ وہ حل اقوام متحدہ کے فیصلے میں موجود تھا کہ بیت المقدس کو سب مذاہب کے لوگوں کے لیے آزاد شہر قرار دے دیا جائے۔ اس کا نظم اس طرح سے قائم کیا جائے کہ مسلمان بھی وہاں جائیں اور عبادت کریں، کیونکہ ان کے لیے یہ ایک مقدس جگہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کی ایک روایت اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس طرح ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقدس مقامات پر جائے اور اپنے جذبات کے لحاظ سے جو کرنا چاہتے ہیں، کریں، اسی طرح یہود کو بھی یہ حق حاصل ہے۔

موجودہ صورت حال یہ نہیں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہے، آپ نے فلسطین کو فتح کیا ہے اور اب آپ نے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کو حق دینا ہے اور کس کو نہیں، بلکہ برطانیہ نے فلسطین کو فتح کر لیا ہے اور فاتح کی حیثیت سے معاملہ اقوام متحدہ کے سپرد کیا، کیونکہ اقوام متحدہ بین الاقوامی قوانین کی نمایندگی کرتی ہے۔ اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں ایک فیصلہ کیا اور اس کے تحت اسرائیل قائم ہو گیا۔ اس فیصلے کے تحت بیت المقدس کو ایک آزاد حیثیت دے دی گئی۔

مسلمانوں کو آج نہیں تو کل اس فیصلے کو تسلیم کر کے اس کے لحاظ سے بیت المقدس کے بارے میں اپنا موقف اختیار کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا اب محض خواہشات ہیں۔ وقت اور زمانہ اپنا فیصلہ کر چکا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ زمانے کو تبدیل کر دیں، اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ پھر ایک دفعہ فتوحات کا دور ہو اور اس میں بڑے بڑے لشکر لے کر نکلیں، پھر آپ دنیا میں اپنا علم لہرائیں اور اس میں فلسطین کو بھی فتح کریں۔ اس کے بعد وہ باتیں کر لیجیے جو آپ کر رہے ہیں۔

اس وقت آپ نیشن اسٹیٹ (nation-state) کے زمانے میں جی رہے ہیں۔ دنیا میں بین الاقوامی قوانین کے تحت معاملات ہوتے ہیں۔ غلط یا صحیح، اس قانون کے مطابق اقوام متحدہ نے فیصلہ کر دیا ہے اور وہ نافذ ہو چکا ہے۔ آپ کو اس کی روح کے مطابق اسے ماننا ہے۔ جب آپ اس کو مان لیں گے تو اس میں جو کچھ بیت المقدس کے بارے میں کہا گیا ہے، وہی آپ کا موقف ہونا چاہیے۔ عملی طور پر جو فیصلہ ہو چکا ہے، وہی نافذ ہو گا۔ اس میں بیت المقدس کی حیثیت کیا طے کی گئی تھی، اگر آپ اس فیصلے کو مان کر یہ موقف اختیار کریں تو اسرائیل جو کچھ کر رہا ہے، وہ اس کا قانونی اور اخلاقی جواز کھو دے گا۔[۵]

۵-https://ghamidi.com/videos/do-only-muslims-have-a-right-over-jerusalem-3158

مسیحی اور یہودیوں کا شرک

سوال: کفار مکہ مشرک، جب کہ شرکیہ اعمال کے باوجود مسیحی اور یہودی مشرک کیوں نہیں؟

جواب: پہلی بات یہ کہ قرآن مجید نے جگہ جگہ یہ بیان کیا ہے کہ قریش مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے۔ جنوں کو بھی وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسلی لحاظ سے منسوب کرنے کی جسارت کرتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ آدمی کسی چیز کو کس حیثیت سے مانتا ہے؟ آپ اس سے پوچھتے ہیں کہ تم یہ کیا مانتے ہو؟ تو وہ کہتا ہے کہ میں اس کو شرک نہیں سمجھتا۔ وہ اس کی ایک تاویل اور توجیہ کرتا ہے۔ اہل کتاب کا معاملہ یہی ہے کہ وہ اپنے شرک کی تاویل و توجیہ کرتے ہیں، جب کہ مشرکین مکہ اپنے شرک کا صاف اعتراف کرتے تھے کہ اللہ نے اپنے شریک ٹھیرائے ہیں، یہ ہمارے شرکا ہیں اور ہم ان کو اسی حیثیت سے مانتے ہیں۔ انھوں نے اپنے شرک کو اپنے اقرار کے ساتھ بطور دین اختیار کیا ہوا تھا۔

قرآن مجید نے اس حوالے سے ہمیں بڑی تعلیم دی ہے کہ وہ آدمی کیا کہتا ہے، یعنی ہم یہ تو دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایک غلط بات کہہ رہا ہے اور شرک کی بات کر رہا ہے، لیکن یہ ہم کہہ رہے ہیں، مگر وہ اپنے اس عمل کو کیا کہہ رہا ہے، اس کو مد نظر رکھا جائے گا۔ اہل کتاب یہ تاویل پیش کر رہے ہیں کہ یہ جو 'بیٹے' کا لفظ ہم نے اختیار کیا ہے، یہ اس طرح نہیں ہے، جس طرح آپ اس کو سمجھ رہے ہیں، بلکہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ذات ہیں، اُس ذات کا اس صورت میں ایک جسدی ظہور ہوا ہے۔ یہ ایسے ہی، جیسے صوفیانہ مذاہب میں یہ کہا جاتا ہے کہ پوری کائنات خدا کا جسدی ظہور ہے۔ چنانچہ وہ تو اصرار کرتے ہیں کہ ہم در حقیقت کسی کو خدا کا شریک ٹھیرا ہی نہیں رہے۔ قرآن مجید نے اس کو شرک قرار دیا ہے اور ہم بھی بتائیں گے کہ یہ شرک ہے، لیکن شرک کرنے والا اسے شرک نہیں مان رہا تو قرآن نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب تک وہ نہیں مان رہا، تم اس کی طرف اُس اقرار کو منسوب نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا. (۴: ۹۴)

”ایمان والو، جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو (کسی اقدام سے پہلے) تحقیق کر لیا کرو اور جو تمھیں سلام کرے، اُسے یہ نہ کہا کرو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔“

آپ دیکھیے کہ قرآن مجید نے اہل کتاب کے ایک ایک شرک کو بیان کیا ہے، مگر ان کو اہل کتاب ہی کہا ہے۔

ان کی یہ تاویل دنیا میں تو چل جائے گی، مگر قیامت میں تو بتانا پڑے گا کہ واقعی ان کو غلطی لگی تھی۔ چنانچہ پروردگار کے سامنے کھڑے ہو کر یہ کہنا کوئی آسان کام نہیں ہو گا، اس لیے کہ دنیا میں بہت سی تاویلات چل جاتی ہیں۔ ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بات کی تاویل کرتا ہے اور وہ اصلاً اس عقیدے کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو چونکہ ہم دنیا میں کسی کے اندر اتر کر نہیں دیکھ سکتے، اس لیے آپ کا یہ کام نہیں کہ اس پر وہ چیز چسپاں کر دیں۔ اہل کتاب اصرار کرتے ہیں کہ وہ توحید کو ماننے والے ہیں۔ اسی چیز کو اصول میں سمجھنا چاہیے کہ کسی شخص پر آپ حکم لگانے کا حق نہیں رکھتے، بلکہ وہ خود بتائے گا کہ میں کیا ہوں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ میں مشرک ہوں تو وہ مشرک ہے، وہ کہتا ہے کہ میں کافر ہوں تو وہ کافر ہے اور اگر وہ نہیں مان رہا تو وہ مشرک و کافر نہیں ہو گا۔ اگر وہ نہیں مان رہا تو پھر آپ اس کو کوئی نام نہیں دے سکتے۔ بس یہیں تک محدود رہیے، جہاں تک اللہ تعالیٰ نے محدود کر دیا ہے۔

مسلمانوں میں بھی لوگوں کو کافر و مشرک کہنا آپ کا کام نہیں ہے۔ ہاں، البتہ شایستگی کے ساتھ ان کو بتائیے کہ آپ ٹھیک ہوں گے، مگر آپ کا یہ عمل قرآن مجید اور حدیث کی روشنی میں شرک ہے۔ ابھی بحث اور گفتگو ہو رہی ہوتی ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ ہم جس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں، وہ دوسرے پر ڈال دیتے ہیں، حالاں کہ وہ ابھی اس نتیجے کو مان ہی نہیں رہا۔[٦]

اہل کتاب کا ذبیحہ

سوال: کیا اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے؟

جواب: ابھی تک کوئی ایسا سائنسی طریقہ ایجاد نہیں ہو سکا کہ جس میں گوشت کو مصنوعی طور پر پیدا کر لیا جائے۔ اگر کوئی ایسا سائنسی طریقہ ایجاد ہو جائے تو یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا، لیکن اس وقت گوشت حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک جانور کی جان لینا پڑتی ہے۔ جانوروں کا گوشت حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ جارحانہ رویہ (aggressive behaviour) اختیار کرتے ہوئے ان کے گلے پر چھری چلائی جاتی ہے، ان کو زندگی سے

٦-https://ghamidi.com/videos/why-are-christians-and-jews-not-called-polytheists-despite-their-polytheistic-practices-3113

محروم کر دیا جاتا ہے اور جس جان کو حرمت حاصل ہے، اس کو چھین لیا جاتا ہے۔

جانور کو ذبح کرنے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ آپ کیا کام کرنے جا رہے ہیں۔ اس کام کو خدا کے حکم اور اذن کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں ہمیشہ سے یہ بات لازم کر دی ہے کہ میں تمھیں جانور کی جان لے کر گوشت حاصل کرنے کی اجازت دے رہا ہوں، لیکن یہ میرے نام اور اتھارٹی پر حاصل کیا جائے گا تاکہ تمھیں ہمیشہ یہ معلوم رہے کہ جان لینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

کسی جانور کو ذبح کرنے کے شرائط درج ذیل ہیں:

ایک یہ کہ جانور خدا کے نام پر ذبح کیا جائے۔ انسان کی جان تو پھر بھی انسان کی جان ہے، مگر خدا نے جانور کی جان کو بھی یہ حرمت دی ہے کہ آپ اگر اس کو مار کر گوشت لینا چاہتے ہیں تو پھر خدا کی اتھارٹی پر لیں۔ یہ 'بسم اللہ، اللہ اکبر' اسی لیے کہا جاتا ہے، یعنی ہم چھری پکڑ کر یہ کہتے ہیں کہ پروردگار، ہم اسے تیری اجازت اور تیرے نام سے ذبح کر رہے ہیں، اس لیے اللہ کا نام لینا لازم ہے، اس کے بغیر آپ کسی جانور کا گوشت لینے کا حق ہی نہیں رکھتے۔ جو شخص خدا کی اجازت کے بغیر ذبح کر رہا ہے، وہ ایک ناحق کام کر رہا ہے۔

دوسری یہ کہ جانور کا خون نکلنا چاہیے۔ چونکہ خون حرام ہے، اس لیے کہ ہر وہ چیز حرام ہے جس سے درندگی کی بو آتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمام درندوں، مثلاً شیر اور چیتے کا گوشت کھانا ممنوع ہے۔ اسی اصول پر خون پینا بھی حرام ہے۔ جانور کا خون کسی بھی طریقے سے نکال دیں تو یہ حلال ہے، یعنی ذبح کرنے کا کوئی مخصوص طریقہ ضروری نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکار کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس طریقے سے بھی خون نکال دو۔

جانور کا خون بہ جانا چاہیے اور اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا چاہیے۔ اللہ کا نام لینے کے لیے کسی مسلمان کا ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ خدا کو ماننے والی کوئی قوم بھی اللہ کا نام لے کر ذبح کر دے اور خون نکال دے تو گوشت بالکل جائز ہو جاتا ہے۔ لیکن ان دو شرائط کے بغیر گوشت کھانا تو الگ بات ہے، جانور کی جان لینے کا کسی کو حق ہی حاصل نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں تو یہ مسئلہ رہا ہی نہیں، کیونکہ اس کام کے لیے مسلمان دنیا کے ہر کونے میں مل سکتے ہیں۔[۷]

۷- https://ghamidi.com/videos/eating-meat-slaughtered-by-jews-and-christians-lawful-or-not-2851

محمد بلال

حیات امین احسن

(۲۰)

نئی نسل کی اصلاح و تربیت

کسی بھی قوم کے باشعور رہنما کی ایک پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ مستقبل پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ نئی نسل کی اصلاح و تربیت سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ امین احسن کے درج ذیل خطاب سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس درجے کے رہنما تھے:

”میں آپ کی اس ذرہ نوازی کے لیے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی مجلس میں مجھے تقریر کی دعوت دی۔ میں نے آپ کے نمائندوں سے معذرت کر دی تھی کہ میں کوئی تقریر نہیں کروں گا البتہ آپ کے تجویز کردہ عنوان پر کچھ متفرق باتیں طلبہ و طالبات کے سامنے عرض کر دوں گا۔ تقریر کا معاملہ یہ ہے کہ نوجوانی میں تو آدمی تقریر شوقیہ کرتا ہے، ادھیڑ پن میں فرائض اور ذمہ داریوں کے تحت یہ کام کرنا پڑتا ہے لیکن بڑھاپے میں آ کر یہ چیز بوجھ بن جاتی ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ میں جوانی میں بھی اس ذمہ داری سے گھبراتا رہا ہوں اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب اس دور میں میرے لیے یہ کام کتنا مشکل بن گیا ہو گا۔

ہر قوم کے مستقبل کا انحصار اس کے نوجوانوں پر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی عظیم سچائیوں میں سے ایک عظیم سچائی ہے۔ خواہ ہم اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ قومیں اپنے رقبوں، اپنی عمارتوں، اپنے باغوں اور چمنوں، اپنے دریاؤں اور پہاڑوں سے باقی نہیں رہتی ہیں بلکہ اپنی آئندہ نسلوں اور اپنے نوجوان سے باقی رہتی ہیں۔ نوجوان اچھے ہوں تو قوم زندہ رہے گی۔ اگر اس کے پاس دریا اور پہاڑ نہ ہوں گے تو وہ اپنے

لیے نئے دریا اور نئے پہاڑ پیدا کر لے گی۔ بر عکس اس کے نوجوان مردہ ہوں تو اشبیلیہ، غرناطہ اور قرطبہ کی عظمتیں تعمیر کرنے والے بھی صرف تاریخ کی ایک داستان عبرت بن کے رہ جاتے ہیں! یہی نکتہ ہے کہ دنیا کی ہر زندہ رہنے والی قوم نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت کو دی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں کو یہ بات عزیز ہوتی ہے کہ صفحۂ عالم میں ان کا مادی وجود بھی قائم رہے اور ان کی معنوی ہستی بھی کار فرما رہے، انھوں نے اپنے بام و در کی آرائش کی بجائے اپنے آگے آنے والے اخلاف کی تہذیب و تربیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم نہیں ہوں لیکن سپارٹا کے لوگوں سے لے کر آج تک قابل ذکر قوموں کے جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں، ان کی بنا پر یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ رومی و یونانی ہوں یا انگریز و امریکن، دنیا کے نقشے پر کوئی پائیدار نقش اسی قوم نے چھوڑا ہے جس نے اپنی آنے والی نسل کی فکر کی ہے۔ سپارٹا والوں کے متعلق میں نے کہیں پڑھا ہے کہ وہ اپنی عمارتوں میں کوئی تراشا ہوا پتھر لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ عمارتوں میں کوئی تراشے ہوئے پتھر لگانا قوم کے اندر تن آسانی اور تعیش پسندی کے رجحان کی دلیل ہے۔ اسی طرح اپنی آئندہ نسلوں کی صحت مندی کے معاملے میں، میں نے سنا ہے کہ وہ اس قدر حساس تھے کہ اس کے لیے انھوں نے بعض ظالمانہ طریقے بھی اختیار کر لیے تھے، مثلاً یہ کہ وہ کمزور بچوں کو سرے سے زندہ ہی نہیں رہنے دیتے تھے۔

ہمارے ہاں، یعنی اسلام میں، اولاد کی اصلاح و تربیت کا جو اہتمام رہا ہے اس کے لیے دوسری چیزوں سے قطع نظر کر کے اگر صرف قرآن ہی پر نظر ڈالیے تو اس کی اہمیت واضح کر دینے کے لیے وہ کافی ہے۔ حضرت ابراہیم کی وصیت اپنی اولاد کو حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب کی وصیت و نصیحت اپنی ذریت کو، حضرت لقمان کی تلقین اپنے بیٹے کو۔ یہ ساری سرگذشتیں اسی لیے بیان ہوئی ہیں کہ ہم ان سے یہ سبق حاصل کریں کہ اچھے اسلاف کے نام اور کام اچھے اخلاق ہی سے باقی رہتے ہیں۔ حضرت نوح کی سرگذشت پڑھیے تو دل تڑپ تڑپ جاتا ہے کہ ان کو اپنے بیٹے کی نا اہلی کا کتنا غم تھا اور انھوں نے اصلاح و تربیت کے لیے کیا کیا زحمتیں اٹھائیں اور کس کس طرح اپنے رب کے آگے آہ و فغاں کی۔ ماہنامہ میثاق لاہور۔ اپریل ۱۹۶۷'' (مقالات اصلاحی ۲/۳۶۵)

دو کاموں کی اہمیت

کسی بھی قوم میں سیاسی اور سماجی سطح پر بہتری اسی وقت آتی ہے جب اس قوم میں فکری سطح پر اصلاحی کام کیا جائے۔ امین احسن اس نکتے سے پوری طرح واقف تھے۔ سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کے نام ایک خط

میں لاہور سے ۲۴؍ جنوری ۱۹۶۰ء کو انھوں نے لکھا:

”میرے سامنے جو دو کام ہیں وہ یہ ہیں:

ایک ایسے فکری و تربیتی مرکز کا قیام جو اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے مقابلہ کے لیے بلند پایہ تصنیفات بھی تیار کرے اور اس مقصد کے لیے اشخاص کی تربیت بھی کرے۔

دوسرا ذہین اور سرگرم لوگوں کے ذریعہ سے جس حد تک بھی ممکن ہو معاشرے کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرنا۔ ان دونوں کاموں کی ذمہ داری ہر اس مسلمان پر عائد ہوتی ہے جو صورت حال کا احساس رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر صاحبِ جذب و تسخیر اشخاص اٹھیں تو ہماری خوش قسمتی ہے لیکن ان کا انتظار کر کے ہم اپنے فرض سے سبک دوش نہیں ہو سکتے۔

اس دوران میں جو خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کاموں کے لئے وقت اور مال کی قربانی کرنے والے تو موجود ہیں لیکن سب اپنے اپنے مقامی میلانات کے تحت سوچ رہے ہیں جس کے سبب سے کوئی موثر کام نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یہ قوتیں ایک بڑے کام کے لئے مجتمع ہو جائیں تو کچھ مفید اور موثر کام ہو سکتا ہے، میں نے فروری کے ”میثاق“ میں اس چیز کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے گا۔

میں درحقیقت موجودہ زمانے کی فاسد عقلیت کو بغیر چیلنج کئے جانے نہیں دینا چاہتا۔ اب یہ اللہ جانتا ہے کہ اس کام کے لئے میرے اندر صلاحیت ہے یا نہیں اور ہے تو کتنی ہے۔

میرے نزدیک یہ کام ضرور ہونا چاہیے اور منظم طور پر ہونا چاہیے، ورنہ ہمیں ڈوب مرنا چاہیے۔“

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۴)

افکار کے ضبط کی فکر

لاہور سے ۱۵؍ اگست ۱۹۸۵ء کو ملک عبدالرشید عراقی صاحب کے نام ایک خط میں امین احسن لکھتے ہیں:

”رمضان سے پہلے میں نے اصولِ تفسیر پر اپنے دس لیکچرز ریکارڈ کرائے ہیں ان میں پوری ایک کتاب کا مواد ہے اور ایسے اہم مباحث بھی ہیں جو تدبرِ قرآن کے مقدمہ میں نہیں آسکے تھے۔ اب اس موضوع پر میرے تمام افکار ضبط میں آ گئے اور ان شاءاللہ اہلِ علم کے استفادہ کے لئے شائع ہو جائیں گے۔

اب اصولِ حدیث پر اپنے لیکچرز میں نے ریکارڈ کرانے شروع کر دیے ہیں۔ غالباً کل پندرہ لیکچرز اصولی مباحث پر ہوں گے۔ یہ اس لیے ریکارڈ کرا رہا ہوں کہ معلوم نہیں مجھے لکھنے کا موقع ملے نہ ملے افکار کا ضبط میں

آجانا ضروری ہے۔ اگر میں ان کو کتابی شکل میں نہ لا سکا تو شاید اللہ تعالیٰ دوسروں کو ان کے جمع و ترتیب کی توفیق بخشے۔ اب اگرچہ ہر سمت سے ایسی کتاب کے لیے مطالبہ ہو رہا ہے لیکن میری قوتِ کار اب کم ہو گئی ہے۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ جب تک زندہ رکھے اپنے دین کی کوئی چھوٹی موٹی خدمت لیتا رہے۔“

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۶)

ذہنی الجھنوں سے نبرد آزما مخاطب

امین احسن اندھی تقلید کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو غور و فکر کرتے ہیں، اگرچہ وہ الجھے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں۔ لاہور سے ۱۶/ فروری ۱۹۶۷ء کو محمود احمد لودھی صاحب کے نام ایک خط میں امین احسن لکھتے ہیں:

”خوشی ہوئی کہ آپ کی بیگم صاحبہ کو میرے بعض مضامین پسند آئے۔ خدا کرے تفسیر بھی پسند آئے۔ دوسری چیزیں بھی میری ان کو پڑھنے کو دیجئے۔ جو لوگ مجھے داد دیتے ہیں ان سے اس پہلو سے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ان کی سمجھ کے باب میں مجھے حسنِ ظن ہو جاتا ہے۔ آپ اس کو خود پسندی پر محمول نہ کیجئے گا۔ واقعہ یہی ہے کہ روشِ عام کے پیر و یا لکیر کے فقیر میری چیزیں پسند نہیں کر سکتے۔ صرف وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو ذہنی الجھنوں سے نبرد آزما ہوئے ہوں۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۱۱)

فکر فراہی کی فکر

فراہی جو علمی کام ادھورے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، امین احسن کو ان کی تکمیل کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

”ایک ملاقات میں کہا:

میں نے ایک دھیلا خرچ کیے بغیر وہ کام کر دیا جس کے لیے ڈاکٹر حفیظ اللہ نے پچاس ہزار کا عطیہ دیا تھا۔ اب انھیں مجھ سے یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ میں نے کچھ نہ کیا۔ اور روز حشر مجھ ان سے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔

اصلاحی صاحب کی یہ بات من وجہ صحیح ہے، لیکن مولانا فراہی کے اصل مسودات آج بھی کسی فرہاد کو ہکن کے منتظر ہیں۔

ایک موقع پر ”تدبر قرآن“ اور فکر فراہی پر دوسرے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے اکیسویں صدی کے

حوالے سے کہا ’’یہ فراہی کی صدی ہے۔‘‘

’’تدبر قرآن‘‘ ہی کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ایک ملاقات میں کہا:

جنھوں نے تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ پڑھی ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی تمام محنت استاد کے کھاتے میں ڈال دی ہے۔

اصلاحی صاحب پانچ سال شب و روز فراہی کی صحبت میں رہے ہیں اور فراہی کی ایک ایک چیز کو پڑھ ڈالا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کے طالب علم ہی نہیں عالم ہیں۔ استاذ ہیں، امام ہیں۔ ان حالات میں اصلاحی صاحب کی زبان سے ذکر فراہی خوشی کی بات ہے:

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

لیکن موقع و محل اور سیاق و سباق کے لحاظ سے اصلاحی صاحب کا ایک پرانا خواب یہاں درج نہ کیا جائے تو شہادت حق کے منافی اور کتمان حق کے مترادف ہو گا خواب اگرچہ خواب ہی ہوتا ہے۔ ’’اضغاث احلام‘‘ لیکن کہتے ہیں بزرگوں کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ پہلے خواب سن لیں۔ اصلاحی صاحب نے مجھ سے بیان کیا:

’’مولانا فراہی کو کبھی کبھی خواب میں دیکھتا ہوں۔ حال ہی میں وہ مجھے خواب میں نظر آئے۔ ملاقات ہوئی تو فرمایا: میں جا رہا ہوں، میں نے دوسری جلد لے لی ہے، بکس خالد کو دے دو۔‘‘

دوسری جلد سے ظاہر ہے مولانا اصلاحی کا اشارہ ’’تدبر قرآن‘‘ کی طرف تھا۔ خالد سے مراد خالد مسعود، مولانا اصلاحی کے ایک شاگرد ہیں۔ بکس کے بارے میں مولانا اصلاحی نے مجھ سے پوچھا کہ بکس سے مولانا کی کیا مراد رہی ہو گی۔ میں نے کہا کہ بکس سے مراد مسودات کا بکس ہو گا، اس کے علاوہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ اصلاحی صاحب نے کہا: ہاں ٹھیک ہے۔

جو لوگ خوابوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ اور اس خواب کے محولہ امور کے بارے میں بھی معلومات رکھتے ہیں۔ وہ اس کی بہتر تشریح کر سکتے ہیں۔ یہ خواب دس بارہ سال پرانا ہے۔ اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے اصلاحی صاحب کے ذہن سے ماضی قریب بھی محو ہوتا گیا اور ماضی بعید بھی۔

بات خواب کی ہو یا بیداری کی ہمارے ساتھ ان کی گفتگوؤں میں زیادہ مدرستہ الاصلاح، دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، پھریہا، اعظم گڑھ، بمہور اور مولانا فراہی کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ایک دن میں گیا تو مولانا کو ہچکیاں آنے لگیں۔ کہنے لگے: میرے استاد کی موت ہچکیوں میں ہوئی تھی میں بھی اسی میں مروں گا۔‘‘ (ذکر فراہی ۵۸۲)

تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ کے بارے میں سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں چاہتا ہوں کہ ایک جلد میری زندگی میں ضرور چھپ جائے تاکہ میری روح استاذ مرحوم سے شرمسار نہ ہو۔" (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸)

قمرالدین اعظمی کانپور کے نام لاہور سے ۱۷ر مئی ۱۹۹۰ء کو خط میں امین احسن نے فراہی سیمینار میں اپنی شرکت کو شرعی فریضہ قرار دیا:

"آپ نے فراہی سیمینار کے موقع پر میری حاضری کو ضروری قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ضروری ہی نہیں، بلکہ میرا شرعی فرض بھی تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ایک نوے سال کے بوڑھے کی ناتوانیوں کا اندازہ کر سکیں۔ میں اس معاملہ میں آپ لوگوں کو مجبور سمجھتا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب میں بھارت کا سفر تو درکنار لاہور کے اندر ہی کسی سفر سے بھی بالکل قاصر ہوں اگر کسی اہم ضرورت سے گھر سے نکلنا پڑتا ہے تو داہنے بائیں دو مددگاروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اب میری حاضری کا خیال دل سے نکال دیجئے۔ ویسے امید ہے کہ یہاں سے بعض احباب جائیں گے اور ان کے ذریعہ سے میری نمائندگی ہو جائے گی۔ البتہ یہ ذمہ داری میں لیتا ہوں کہ میں برابر دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس سیمینار کو ہر پہلو سے کامیاب بنائے۔ اب تک آپ نے طلبائے قدیم کی پرزور ترجمانی کی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اب اسی زور کے ساتھ میری ترجمانی کا فریضہ بھی ادا کریں گے۔" (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۸)

خالد مسعود اور جاوید احمد غامدی کی حیثیت

خالد مسعود صاحب اور غامدی صاحب کا امین احسن کے ہاں کیا مقام تھا، اس کی وضاحت ایک گفتگو سے ہوتی ہے، جو امین احسن نے ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کے ساتھ کی۔ ڈاکٹر ابوسفیان لکھتے ہیں:

"س۔ فراہی سیمینار کے لیے آپ کا پیغام ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں؟

ج۔ ابھی سے پیغام ریکارڈ کر کے کیا کرو گے، جب یہاں سے لوگ جائیں گے میں انھیں کچھ نہ کچھ ریکارڈ کروا کے دے دوں گا اور اگر ہو سکا تو انھیں املا کرا دوں گا۔

س۔ فراہی سیمینار میں کن کن لوگوں کو یہاں سے بھیجیں گے؟

ج۔ دیکھو فراہیات کے سلسلے میں یہاں دو لوگوں کا خاص تعلق ہے: ایک خالد مسعود اور دوسرے جاوید الغامدی۔ ان دونوں کو میں نے تاکید کی ہے کہ وہ مقالات کے ساتھ سیمینار میں شریک ہوں۔ باقی ممکن ہے کہ کچھ اور لوگ بھی جائیں۔" (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۵)

اہم ترین ساتھی

”تدبر قرآن“ کی تکمیل پر ریڈیو پاکستان نے ۲۳/ مارچ ۱۹۸۲ء کو لاہور میں امین احسن کا انٹرویو لیا۔ اس میں امین احسن نے اپنے اہم ترین ساتھیوں کا نام لیا۔

”سوال: وہ کون لوگ ہیں جن سے آپ کو توقع ہے ؟

جواب: میرے ساتھیوں میں سے خالد مسعود صاحب ہیں، عبد اللہ صاحب ہیں، جاوید احمد صاحب ہیں۔ اسی طرح اعظم گڑھ میں جو لوگ کام کر رہے ہیں ان میں مولانا بدر الدین صاحب ہیں۔ اب ان لوگوں سے میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ اس کام میں حصہ لیں۔“ (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۴)

شاگردوں کی جستجو

علمی کاموں میں کسی صاحب علم کے بہترین ساتھی اس کے شاگرد ہوتے ہیں۔ یہ شاگرد ہی ہوتے ہیں جو استاد کے ادھورے کاموں کی تکمیل کرتے ہیں اور استاد کے مشن کے لیے تسلسل اور دوام کا باعث بنتے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں لاہور سے جناب محمود احمد لودھی کے نام امین احسن ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”آپ کے لاہور آنے کا آپ سے زیادہ میں طالب ہوں۔ استاذ مرحوم کو آخری دورِ زندگی میں سب سے زیادہ جستجو چند شاگردوں کی ہوئی تھی، یہی حال اس دور میں میرا ہے۔ انھی کی طرح میں بھی بہت کم لکھ سکا۔ پھر میرے پاس اپنی ہی نہیں بلکہ ان کی بھی امانت ہے۔ یہ تو اللہ کو علم ہے کہ اب کتنی مہلت باقی ہے، لیکن اب میں اپنی صحت کی طرف سے زیادہ پر امید نہیں ہوں۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۴۴)

شاگردوں کی تربیت اور حوصلہ افزائی

اچھے استاد کو صرف اپنے کاموں کی تکمیل ہی کی فکر نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کی نشو و نما کے لیے بھی بے چین رہتا ہے۔ لاہور سے ۱۳/ فروری ۱۹۶۷ء کو جناب محمود احمد لودھی کے نام امین احسن ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”لکھنے کے معاملے میں اپنے شرمیلے پن کو خدارا اب دور کر دیجیے۔ اب اس کو طول دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر آپ نے اس حجاب کو دور نہ کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی یہ صلاحیت جامد ہو کر رہ جائے گی اور یہ ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا۔ اس کے لیے میری دعا اسی وقت کارگر ہو گی جب آپ عملاً کچھ کریں گے اور کچھ

نہیں تو پہلے کچھ ترجمہ و تلخیص ہی کا کام شروع کیجیے۔ مولاناؒ کا کوئی مسودہ سامنے رکھ کر لکھیے یا جمہرہ (مراد امام فراہیؒ کی کتاب جمہرۃ البلاغہ ہے۔ مدیر) کو اردو میں کر ڈالیے مقصود آپ کے حجاب کو توڑنا ہے...

ادھر دو ہفتے طبیعت بجھی رہی۔ مجھ پر یہ دورے پڑتے رہتے ہیں۔ شکر گزار ہوں کہ آپ لوگ میرے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔“

اسی طرح ۲۷ر فروری ۱۹۶۷ء کو لودھی صاحب کو خط میں کہتے ہیں:

”خوشی ہوئی کہ آپ نے لکھنے کے لیے اسلحہ سنبھال لیے ہیں۔ اصل میں جس سبب سے میں زیادہ زور دے رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کام میں جو جھجک ہوتی ہے اس کے دور ہونے کا یہی زمانہ ہے اگر آج یہ دور نہ ہوئی تو پھر اس کا دور ہونا بڑا مشکل ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی افادی حیثیت بہت محدود ہو کر رہ جائے گی۔ شہرت حاصل کرنے کی خواہش تو بے شک کوئی اچھی چیز نہیں ہے لیکن حصولِ کمال کی جدوجہد نہ صرف محمود ہے بلکہ ذی صلاحیت لوگوں کے لیے فرائض میں ہے۔ آپ اپنی ذہانت کی قدر کریں اور اس دور میں اس کی صحیح قدر کی شکل یہی ہے کہ قرآن کو اپنی فکر کا موضوع بنائیں اور اپنے فکر کو عمدہ اسلوب سے پیش کرنے کا سلیقہ پیدا کریں۔“

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۴۵)

لاہور سے ۱۳ر مارچ ۱۹۸۶ء کو ایک خط میں لکھا:

”شانِ نزول اور احوالِ عرب کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شان نزول اور کلام کے موقع و محل کو خود کلام سے اخذ کرنے کی کوشش کیجیے۔ ایک اعلیٰ کلام اپنے پس منظر اور ماحول کو خود بہتر طریقہ پر واضح کر دیتا ہے۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز پڑھیے تو اونچے درجے کے ذی علم لوگوں کی چیز پڑھیے۔ گھٹیا قسم کے کتاب فروشوں کی چیزیں پڑھنے پر وقت صرف نہ کیجیے۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۳۱)

ذہنی تربیت کی غذا دیتے رہنا

مولانا وحید الدین خاں، امین احسن کے طرز تعلیم کا ایک انداز واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میرے زمانۂ تعلیم میں مولانا امین احسن اصلاحی مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ تجربے کے مطابق مولانا موصوف ایک بہترین مدرس تھے۔ وہ اگر مدرسے میں مستقل قیام کرتے تو وہ زیادہ بڑا کام کر سکتے تھے۔ تقسیم ملک کے وقت وہ پاکستان چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ میرے نزدیک، مولانا موصوف کا مدرسۃ الاصلاح چھوڑ کر جانا کوئی درست فیصلہ نہ تھا۔ اگر وہ آخر وقت تک مدرسہ میں قیام کرتے تو

وہ تعمیرِ افراد کی صورت میں ملت کو زیادہ بڑا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے اندر ایک خاص صفت تھی جو میں نے اپنے تجربے میں کسی اور استاد میں نہیں پائی، وہ ہے تدریس کے دوران ذہنی تربیت کی غذا دیتے رہنا۔ اس نوعیت کا ایک نمایاں واقعہ یہاں راقم الحروف کی کتاب ''دین وشریعت'' سے نقل کیا جاتا ہے:

''مدرسۃ الاصلاح میں قرآن خصوصی طور پر داخلِ نصاب تھا۔ یہاں مجھے یہ موقع ملا کہ میں مشہور عالمِ دین اور مفسر مولانا امین احسن اصلاحی (صاحب تدبر قرآن) سے براہِ راست قرآن کی تعلیم حاصل کروں۔ مولانا محترم اس مدرسے میں استادِ تفسیر بھی تھے اور صدر مدرس بھی۔ ایک روز درس قرآن کے تیسویں پارہ کی یہ آیت سامنے آئی:

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ.[14] (سورۃ الغاشیۃ: آیت ۱۷)

استاد محترم امین احسن اصلاحی نے اس موقع پر طلبہ سے سوال کیا کہ اونٹ کے سم پھٹے ہوتے ہیں یا جڑے ہوئے ہوتے ہیں، یعنی وہ بیل کی مانند ہوتے ہیں یا گھوڑے کی مانند۔ اس وقت ہماری جماعت میں تقریباً ۲۰ طالبِ علم تھے مگر کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ اس کا جواب نہ دے سکا۔ ہر ایک اٹکل سے کبھی ایک جواب دیتا کبھی دوسرا جواب۔

اس کے بعد استاد محترم نے ایک تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ تمھارے جوابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگ اونٹ کے سم کی نوعیت کے بارے میں نہیں جانتے۔ پھر انھوں نے عربی زبان کا یہ مقولہ سنایا: ''لا ادری نصف العلم'' (میں نہیں جانتا آدھا علم ہے) اس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر تم لوگ یہ جانتے کہ تم اونٹ کے سم کے بارے میں بے خبر ہو تو گویا کہ اس معاملے میں تمھارے پاس آدھا علم موجود ہوتا۔ کیونکہ اپنی لاعلمی کو جاننے کے بعد تمھارے اندر یہ شوق پیدا ہوتا کہ تم اپنے علم کو مکمل کرنے کے لئے یہ معلوم کرو کہ اونٹ کے سم کیسے ہوتے ہیں۔ 'لا ادری' کا شعور تمھارے اندر بیدار ہوتا تو اونٹ پر نظر پڑتے ہی تم اس کے سم کو غور سے دیکھتے اور پھر تم اپنے نہ جاننے کو جاننا بنا لیتے۔

مدرسے کا یہ واقعہ میرے لئے اتنا موثر ثابت ہوا کہ یہ میرا عمومی مزاج بن گیا کہ میں ہر معاملے میں اپنی ناواقفیت کو جانوں، تاکہ میں اس کو واقفیت بنا سکوں۔'' (ماہنامہ الرسالہ، مئی ۲۰۰۹ء، ص ۳۸)

---

[14] ''کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے، وہ کیسے بنائے گئے ہیں۔''

ریاضت

امین احسن قرآن مجید کا مطالعہ ریاضت کے انداز میں کرتے اور اسی کی اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کرتے۔ سلیم کیانی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا قرآن پر تدبر میں پوری طرح منہمک رہتے۔ ان کے شاگردوں کو ان کی اس ریاضت سے بڑا فائدہ ہوتا۔ ان کی ہدایت یہ ہوتی ''ایک سورۃ کا اس وقت تک مطالعہ کیا کرو کہ جب تم اپنی آنکھیں بند کرو تو پوری سورۃ کا سراپا اس کے شروع سے آخر تک اپنے پورے جمال کے ساتھ تمھارے ذہن کے سامنے آجائے۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۲۷)

[باقی]

Monthly
ISHRAQ
Lahore

May 2025
Vol.37 No.5
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ''اشراق'' کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ''اشراق'' کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ''اشراق'' کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست وبازو بھی ہیں۔ ''اشراق'' کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کردیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق